فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	نعیم احمد	۴

قرآنیات

البیان: ہود ۱۱: ۱-۲۴ (۱)	جاوید احمد غامدی	۵

معارف نبوی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء	امین احسن اصلاحی	۱۵

دین و دانش

روزہ	جاوید احمد غامدی	۱۹

نقطۂ نظر

دین یا لادینیت ــــ ایک عقلی جائزہ	ڈاکٹر عدیل احمد	۲۳

ادبیات

احسانات الٰہی	ڈاکٹر مولوی نذیر احمد	۵۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد

''قرآنیات'' میں حسب روایت جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا ہے۔ یہ قسط سورۂ ہود (۱۱) کی آیات ۱۔۲۴ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لیے پہلے بنیادی باتیں اختصار کے ساتھ بیان کی ہیں، پھر ان کی تفصیل کی ہے۔ جزا و سزا کا انکار کرنے اور اس کا مذاق اڑانے والوں کو سرزنش کی ہے اور انھیں دنیا و آخرت میں بڑے عذاب سے ڈرایا ہے۔ صبر اور شکر کی راہ اپنانے والوں کو بہترین اجر اور جنت کی نوید سنائی ہے۔

''معارف نبوی'' میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسما کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون شامل ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف دو نام محمد اور احمد ہیں، اس کے علاوہ جو نام موجود ہیں، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات یا افعال ہیں جنھیں ناموں کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

''دین و دانش'' کے تحت رمضان المبارک کی مناسبت سے جناب جاوید احمد غامدی کا مضمون ''روزہ'' شائع کیا ہے۔ اس میں روزے کی تعریف، تاریخ، مقصد اور قانون کی وضاحت کی گئی ہے۔

''نقطۂ نظر'' میں ''دین یا لادینیت —— ایک عقلی جائزہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر عدیل احمد کا مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے خالق کے وجود، یعنی توحید کو ماننے والے اور اس کا انکار کرنے والے لوگوں پر بحث کی ہے۔ خصوصاً مضمون کا مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو علم ہی نہیں کہ وہ خدا کی ذات کا اقرار کرنے والوں میں سے ہیں یا انکار کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایمان رکھنے والوں کے لیے توحید، رسالت اور اسلام کے حوالے سے مدلل دلائل پیش کیے ہیں اور ایمان نہ رکھنے والوں کے لیے ان کے رویے کی عمومی وجوہات کو واضح کیا ہے۔

''ادبیات'' میں ڈاکٹر مولوی نذیر احمد کی نظم شائع کی ہے۔ اس میں انھوں نے نعمتوں کے حوالے سے احسانات الٰہی کو بیان کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة هود

(۱)

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲

یہ سورۂ 'الر' ہے۔[۱۲۰] یہ کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں، پھر خداے حکیم وخبیر کی طرف سے اُن کی تفصیل کی گئی ہے[۱۲۱] کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔[۱۲۲] میں اُس کی طرف سے تمھیں خبردار کرنے

۱۲۰؎ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۱۲۱؎ یعنی پہلے ایجاز، جامعیت اور اختصار کا طریقہ اختیار کیا گیا، پھر اُنھی گٹھے ہوئے، جامع اور مختصر گویا دریا بہ کوزہ جملوں کی تفصیل کر دی گئی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود اُس اہتمام خاص کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے جو اُن کی تعلیم و تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اِس کتاب میں ملحوظ رکھا ہے... آخر میں حکیم وخبیر کی صفات کا حوالہ ہے، اِس لیے کہ خداے حکیم ہی جان سکتا تھا کہ وہ حکمت کے خزانوں کو کس طرح مختصر لفظوں میں بند کرے اور پھر خداے خبیر ہی کی یہ شان تھی کہ وہ کھول کر دکھائے کہ ایک کوزے میں کتنے دریا اور کتنے سمندر بند ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/۱۰۷)

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ وَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿٣﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤﴾
اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ
مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٥﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ

والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ تم اپنے پروردگار سے معافی چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو، وہ تمھیں ایک متعین مدت تک اچھی طرح بہرہ مند کرے گا اور ہر اُس شخص کو جو اُس کے فضل کا مستحق ہے، اپنے فضل سے نوازے گا۔ لیکن اگر منہ پھیرو گے تو میں تمھارے اوپر ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[123]۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[124]۔ ۱-۴

اِنھیں دیکھتے ہو، یہ اپنے سینے موڑتے ہیں کہ خدا سے چھپ جائیں۔ خبردار، جب (اِسی مقصد سے) اپنے اوپر چادریں لپیٹتے ہیں، (یہ اُس وقت بھی اُس کی نظر میں ہوتے ہیں)[125]۔ وہ جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اُن بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہوتے

۱۲۲؎ یہ قرآن کا بنیادی پیغام ہے جو انبیا علیہم السلام کی دعوت میں ہر جگہ کم و بیش اِنھی الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

۱۲۳؎ یہ اُس انذار و بشارت کی تفصیل کر دی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے مراد وہی عذاب ہے جو رسولوں کے منکرین پر اِسی دنیا میں آ جاتا ہے اور وہ یک قلم ختم کر دیے جاتے ہیں۔

۱۲۴؎ اِس ابہام کے اندر جو تخویف ہے، وہ اگر غور کیجیے تو ہر صراحت سے بڑھ گئی ہے۔

۱۲۵؎ سینہ موڑنا اور چادر لپیٹ کر چل دینا، یہ دونوں تعبیریں اُن کے گریز و فرار کی تصویر کے لیے ہیں، جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار سے بچنے کے لیے آپ کی بات کو نظر انداز کرتے اور جہاں آپ بیٹھے ہوتے، وہاں سے متکبرانہ نکل جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرمایا کہ اِنھیں دیکھو، یہ اُس سے چھپنا چاہتے ہیں جو اِن کے سینوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ اِس سے بڑھ کر حماقت کیا ہو سکتی ہے۔ جس میں یہ تمھارے انذار کے بعد مبتلا ہو

اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُھَا وَیَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّھَا وَمُسۡتَوۡدَعَھَا کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶﴾
وَھُوَالَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرۡشُہٗ عَلَی الۡمَآءِ
لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ

ہیں۔ زمین پر چلنے والا کوئی جان دار نہیں ہے، جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔ وہ اُس کے ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور اُس جگہ کو بھی جہاں وہ (مرنے کے بعد زمین کے) سپرد کیا جائے گا۔ یہ سب ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔[126] ۵-۶

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ہے[127] اور (تمھاری پیدایش سے پہلے) اُس کا عرش پانی پر تھا[128] ــــــ اِس لیے (پیدا کیا ہے) کہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے

گئے ہیں۔

۱۲۶؎ اِن آیتوں میں انذار کے جو تہ در تہ پہلو ہیں، اُنھیں کھول دیجیے تو جو مضمون سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا سے کیا چھپانا چاہتے ہو؟ اُس کا علم تو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جو ہر جان دار کو جہاں کہیں بھی وہ ہو، اُس کی روزی پہنچا سکتا ہے، اُس سے تمھاری کوئی چیز کس طرح مخفی ہو سکتی ہے؟ تم بھی اُسی کے رزق پر پلتے، مگر اُس کی دعوت سے گریز کرتے ہو۔ یاد رکھو، خدا تمھارے ٹھکانوں سے بھی واقف ہے اور مرنے کے بعد جس زمین کے سپرد کیے جاؤ گے، اُسے بھی جانتا ہے۔ ایک دن آئے گا، جب زمین یہ امانت اپنے پروردگار کے حوالے کرے گی اور تم جواب دہی کے لیے پیش کر دیے جاؤ گے۔ اُس کے لیے ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج کر کے محفوظ کر لی گئی ہے۔

۱۲۷؎ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے حساب سے ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں اور پچاس ہزار سال کے برابر بھی۔ مدعا یہ ہے کہ دنیا کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کے ارادے سے، اُس کی اسکیم کے مطابق اور ایک ترتیب و حکمت کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ یہ بے مقصد نہیں ہو سکتی، اِس کے پیچھے لازماً ایک غایت ہے جو جلد یا بدیر ظہور میں آ کر رہے گی۔

۱۲۸؎ یعنی اِس سے پہلے یہ کرۂ ارض پانی ہی پانی تھا اور خدا کی حکومت بھی اِسی پانی پر قائم تھی۔ زمانۂ رسالت میں لوگ قرآن کے اِس بیان پر اظہار تعجب کر سکتے تھے، مگر دور حاضر کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کے بارے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷﴾ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْھُمُ الْعَذَابَ
اِلٰٓی اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّیَقُوْلُنَّ مَا یَحْبِسُهٗ اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْھِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْھُمْ وَحَاقَ
بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ ﴿۸﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰھَا
مِنْهُ اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَھَبَ
السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اُولٰٓئِکَ لَھُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾

والا ہے۔[۱۲۹] اب (اے پیغمبر)، اگر تم اِن سے کہتے ہو کہ (لوگو)، مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو یہ منکرین فوراً بول اٹھیں گے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔[۱۳۰] اور اگر کچھ مدت کے لیے ہم اِن سے عذاب کو ٹال دیں گے[۱۳۱] تو ضرور پوچھیں گے کہ اِسے کیا چیز روکے ہوئے ہے؟ سنو، جس دن وہ اِن کے اوپر آ پڑے گا تو اِن سے پھیرا نہ جاسکے گا اور وہی چیز اِن کو آ گھیرے گی جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ ہم اُس کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں، پھر اُس سے اُسے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اُس کو پہنچی تھی، ہم اُسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میری مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں۔ (پھر) وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے والا بن جاتا ہے۔[۱۳۲] اِس سے وہی مستثنیٰ ہیں جو صبر کرنے والے اور اچھے عمل کرنے والے ہیں۔ اُنھی کے

میں یہی حقیقت ہے جو قرآن نے صدیوں پہلے بیان کر دی تھی۔

۱۲۹؎ یہ اُس غایت کا بیان ہے جس کے لیے دنیا اہتمام کے ساتھ اور چھ دن میں پیدا کی گئی ہے جو ہمارے حساب سے ہزاروں لاکھوں سال کے برابر ہو سکتے ہیں۔ انسان کو ارادے کی آزادی اور خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت اِسی مقصد سے دی گئی ہے۔ اُس کا خالق دیکھ رہا ہے کہ وہ خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے یا شر کا۔ اُسے بتا دیا گیا ہے کہ اپنے اِس انتخاب کے لیے وہ ایک دن جواب دہ ٹھیرایا جائے گا اور اِس کی جزا یا سزا پائے گا۔

۱۳۰؎ یعنی زبان و بیان کی جادوگری ہے، اِس سے زیادہ اِس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

۱۳۱؎ یعنی اُس عذاب کو جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ
اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ

لیے مغفرت بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔ ۷-۱۱

سو (اے پیغمبر)، تم پر جو وحی کی جا رہی ہے، تم (اِن کے اِس رویے کی وجہ سے) اُس میں سے شاید کچھ چھوڑنا چاہتے ہو[۱۳۳] اور اِس بات پر تنگ دل ہو رہے ہو کہ یہ لوگ کہیں گے کہ اِس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اِس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ (حقیقت یہ ہے کہ) تم تو صرف خبردار کرنے والے ہو اور (آگے) ہر چیز اللہ کے حوالے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اِسے خود گھڑ لیا ہے[۱۳۴]؟ اِن

۱۳۲؎ یہ بات اگرچہ لفظ 'انسان' کے ساتھ کہی گئی ہے، لیکن مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر سے آ رہا ہے۔ اُن سے منہ پھیر کر ایک کلیے کے انداز میں بتایا ہے کہ یہ معاملہ انھی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ انسان کی بدقسمتی ہے کہ عام طور پر وہ یہی کرتا ہے۔

۱۳۳؎ یعنی وہ چیزیں پیش کرنے سے گریز کرنا چاہتے ہو جو تمھارے مخاطبین کو پسند نہیں ہیں۔ اِس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ فی الواقع ایسا کرنا چاہتے تھے۔ یہ درحقیقت پیش بندی کا جملہ اور حالات کی سنگینی، مخالفانہ ردعمل کی شدت اور طنز و استہزا کے طوفان میں پامردی اور استقامت کی تلقین ہے جو اِس اسلوب میں کی گئی ہے تاکہ اِس طرح کا کوئی خیال بھی آپ کے دل میں نہ گزرے۔ آیت میں لفظ 'لَعَلَّ' اِسی پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ خطاب میں جو تیزی محسوس ہوتی ہے، اُس کا رخ بھی، اگر غور کیجیے تو اُنھی معاندین کی طرف ہے جو اپنے رویے سے یہ صورت حال پیدا کر رہے تھے۔

۱۳۴؎ یہ استفہام اظہار تعجب کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اوپر کے اعتراضات تو سادہ اسلوب میں نقل کر دیے ہیں، لیکن قرآن کو پیغمبر کی گھڑی ہوئی کتاب قرار دینا ایک نہایت عجیب بات تھی، بالخصوص اُن لوگوں کی زبان سے جو کلام کے حسن و قبح کے نقاد اور اُس کے ایجاز و اعجاز کے قدردان بھی تھے اور موازنے اور مقابلے کے لیے اُن کے پاس اپنے چوٹی کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا ایک دفتر بھی موجود تھا۔ اِس وجہ سے اِس کا ذکر تعجب کے اسلوب میں فرمایا۔" (تدبر قرآن ۴/۱۱۲)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ
بِعِلۡمِ اللّٰہِ وَاَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَھَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا وَزِیۡنَتَھَا نُوَفِّ اِلَیۡھِمۡ اَعۡمَالَھُمۡ فِیۡھَا وَھُمۡ فِیۡھَا
لَا یُبۡخَسُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَیۡسَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا

سے کہو، پھر تم بھی اِسی طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچے ہو۱۳۵۔ سو اگر وہ تمھاری مدد کو نہ پہنچیں تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۱۳۶۔ پھر کیا تم مانتے ہو؟ ۱۲-۱۴

(یہ اِس لیے منکر ہو رہے ہیں کہ دنیا کی زندگی نے اِنھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اِنھیں بتا دو کہ) جو دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت چاہتے ہیں، ہم اُن کے اعمال کا بدلہ اُن کو یہیں چکا دیتے ہیں اور اُس میں اُن کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں

۱۳۵؎ یعنی اپنے اِس گمان میں سچے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کتاب اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں تو اِس کا فیصلہ نہایت آسانی کے ساتھ اِسی طرح ہو سکتا ہے کہ اِس شان کی دس سورتیں تم بھی بنا لاؤ۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے تمھاری قوم کے ایک فرد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے۔ سورۂ طور ۵۲ کی آیات ۳۳-۳۴ میں یہی بات 'بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖۤ' کے الفاظ میں فرمائی ہے۔ یہ سورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اِس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے یہ مطالبہ منکرین کے سامنے پہلے بالاجمال پیش کیا، پھر اِسی اجمال کو حسب موقع مختلف الفاظ میں کھول دیا ہے۔ اِس میں کوئی ترتیب و تدریج ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۳۶؎ اِس آیت میں خطاب براہ راست ہو گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ تمھارے معبود اگر اِس موقع پر بھی تمھاری مدد کو نہ پہنچیں تو مان لو کہ یہ علم الٰہی کا فیضان ہے۔ چنانچہ تم سب مل کر بھی اِس شان کی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے اور اِس کا یہ دعویٰ بھی بالکل سچا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

۱۳۷؎ یہ ایک سنت الٰہی کے حوالے سے اُن کے مغالطے پر تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے

صَنَعُوْا فِیْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓی اِمَامًا وَّ رَحْمَةً اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

ہے[۱۳۷]۔ دنیا میں جو کچھ اُنھوں نے بنایا، وہ سب ملیامیٹ ہوا اور اُن کا کیا دھرا اب باطل ہے۔ ۱۵-۱۶

سو کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک برہان[۱۳۸] پر ہے، پھر (اُس کی تائید میں) اُس کے بعد ایک گواہ بھی اُس کے پروردگار کی طرف سے آ جاتا ہے[۱۳۹] اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت[۱۴۰] کے طور پر آئی ہوئی موجود ہے، (اِس قرآن کا انکار کر سکتا ہے[۱۴۱]؟ ہرگز نہیں)۔ اِس طرح کے لوگ تو اِس پر ایمان ہی لائیں گے۔ اور (تمھارے مخاطبین کے) اِن گروہوں میں جو شخص بھی اِس کا منکر ہوگا، اُس کے لیے وعدے کی جگہ دوزخ ہے۔ اِس لیے، (اے پیغمبر) تم اِس کے بارے میں کسی

ہیں، اُسی کے لیے جیتے، اُسی کے لیے مرتے اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کا حساب اللہ تعالیٰ جس کو جتنا دینا چاہتا ہے، دے کر اِسی دنیا میں بے باق کر دیتا ہے اور اُن کی تمام کارگزاریوں کا پھل اُنھیں یہیں مل جاتا ہے۔ اِس سے وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ آخرت اگر ہوئی بھی تو اُس میں بھی وہی خدا کے محبوب ہوں گے۔ فرمایا کہ اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ آخرت میں اُن کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۱۳۸۔ اِس سے مراد وہ نور فطرت ہے جو حق و باطل اور خیر و شر کے مبادی میں امتیاز کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے اندر ودیعت کر دیا ہے۔

۱۳۹۔ یعنی وحی الٰہی جو 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ' (روشنی پر روشنی) ہو کر آتی اور انسانی فطرت کے اندر خدا کے ودیعت کردہ مبادی کی تصدیق کر دیتی ہے۔ لفظ 'یَتْلُوْهُ' میں ضمیر مذکر آئی ہے۔ اِس کا مرجع لفظ 'بَیِّنَة' ہے، لیکن اُس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے، اِس لیے یہ معنی کے لحاظ سے آ گئی ہے۔

۱۴۰۔ یعنی دنیا میں رہنما اور آخرت میں خدا کی رحمت جو ایمان والوں کو لازماً اپنے دامن میں لے لے گی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ
الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾
الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

شک میں نہ پڑو[۱۴۲]۔ یہ حق ہے تمھارے پروردگار کی طرف سے، مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ (اِنھیں بتادو کہ) اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑیں[۱۴۳]؟ وہ اپنے پروردگار کے حضور پیش کیے جائیں اور گواہی دینے والے[۱۴۴] گواہی دیں گے کہ یہی ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے اُن ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اُس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں[۱۴۵] اور وہی

۱۴۱؎ اِس طرح کے استفہامیہ جملوں میں بعض اوقات کلام کا ایک حصہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے اُسے کھول دیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن کا انکار اِس طرح کے دنیا پرست ہی کر سکتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، اِس لیے کہ اُن کی غلط روی کی وجہ سے اُن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہوتا ہے اور جن کی فطرت کا نور بجھ چکا ہو، وہ قرآن پر ایمان لانے والے نہیں بن سکتے۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف اشارہ اُن اہل کتاب کی طرف بھی کر دیا ہے جو اگرچہ ابھی پوری طرح سامنے تو نہیں آئے تھے، لیکن اندر اندر مخالفت کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۴۲؎ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ شامت زدہ لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں تو جھٹلائیں، اِن کے اِس رویے پر تمھیں کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ بات درحقیقت اُنھی بدبختوں کو سنائی گئی ہے جو قرآن کی مخالفت کے درپے تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس طرح کے جملوں میں جو عتاب ہوتا ہے، اُس کا رخ... مخالفین کی طرف ہوتا ہے، لیکن وہ لائق التفات نہیں رہ جاتے، اِس وجہ سے اُن کو خطاب کر کے بات براہ راست کہنے کی بجائے پیغمبر کو خطاب کر کے کہہ دی جاتی ہے۔ زجر و ملامت کا یہ اسلوب بسا اوقات براہ راست زجر و تنبیہ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ قرآن میں اِس کی نہایت دل آویز مثالیں موجود ہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۱۸)

۱۴۳؎ یعنی اُس کے شریک ٹھیرائیں۔ قرآن میں یہ تعبیر شرک کے لیے بھی اختیار کی گئی ہے اور اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کے لیے بھی، جو شرک ہی کی ایک صورت ہے۔ سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہاں شرک ہی مراد ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ
يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا
اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ
كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

آخرت کے منکر ہیں۔ وہ زمین میں خدا کی گرفت سے باہر نہیں تھے اور نہ خدا کے سوا اُن کا (وہاں) کوئی حمایتی تھا۔ (تاہم جو ڈھیل ہم نے اُنھیں دے رکھی تھی، اُس کی بنا پر وہ یہی سمجھتے رہے)۔ اُنھیں اب دہرا عذاب[۱۴۶] دیا جائے گا۔ (اِس لیے کہ) نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے[۱۴۷]۔ وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو کچھ گھڑتے تھے، وہ سب اُن سے کھویا گیا۔ اِس میں شک نہیں کہ آخرت میں وہی سب سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے۔ (اِس کے برخلاف) جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے اور اپنے پروردگار کی طرف جھکے رہے، وہی جنت کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِن دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور ایک دیکھنے والا اور سننے والا[۱۴۸]۔ کیا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ پھر کیا سوچتے نہیں ہو۔ ۱۷-۲۴

۱۴۴؎ یہ گواہی خدا کے پیغمبر بھی دیں گے جنھیں اتمام حجت کے لیے بھیجا گیا اور اُس کے فرشتے بھی جو لوگوں کے اعمال کا ریکارڈ رکھنے پر مامور ہیں۔

۱۴۵؎ یعنی توحید کی صراط مستقیم سے ہٹا کر لوگوں کو مشرکانہ عقائد کی بھول بھلیاں میں الجھانا چاہتے ہیں۔

۱۴۶؎ دہرا اِس لیے کہ یہ خود بھی خدا کی راہ سے رکے اور دوسروں کو بھی روکے رہے۔

۱۴۷؎ مطلب یہ ہے کہ نہ اللہ و رسول کی بات سننے کے لیے تیار تھے اور نہ انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر اُن سے کوئی سبق حاصل کرتے تھے۔

۱۴۸؎ یہ اُنھی منکرین کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر 'مَا کَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا کَانُوْا یُبْصِرُوْنَ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

[باقی]

''روزے کی عبادت ...اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں پر قابو پا سکے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب آدمی اس مقصد کو روزوں میں ملحوظ رکھے اور ان رغبتوں کو حتی الامکان دبائے جن کے آگے اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اکثر بے بس ہو جایا کرتا ہے اور یہ بے بسی اس کو بہت سی اخلاقی اور شرعی کمزوریوں میں مبتلا کر دیتی ہے، لیکن بہت سے لوگ اس مقصد کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتے، ان کے نزدیک روزے کا مہینا خاص کھانے پینے کا مہینا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس مہینے میں کھانے پینے پر جتنا بھی خرچ کیا جائے، خدا کے ہاں اس کا کوئی حساب نہیں ہوگا۔ اس خیال کے لوگ اگر — خوش قسمتی سے — کچھ خوش حال بھی ہوتے ہیں تو پھر تو فی الواقع ان کے لیے روزوں کا مہینا کام و دہن کی لذتوں سے متمتع ہونے کا موسم بہار ہی بن کے آتا ہے۔ وہ روزے کی پیدا کی ہوئی بھوک اور پیاس کو نفس کشی کے بجائے نفس پروری کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ وہ صبح سے لے کر شام تک طرح طرح کے پکوانوں کے پروگرام بنانے اور ان کے تیار کرانے میں اپنے وقت صرف کرتے ہیں اور افطار سے لے کر سحر تک اپنی زبان اور اپنے پیٹ کی تواضع میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ میں ایک ایسے بزرگ سے واقف ہوں جو ایک دین دار آدمی تھے، لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ رمضان کا مہینا کھانے پینے کا خاص مہینا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے تحت وہ رمضان کے مہینے کے لیے کھانے پینے کی مختلف چیزوں کا اہتمام بہت پہلے سے شروع کر دیتے تاکہ رمضان میں ان کی تنوعات سے متمتع ہو سکیں۔'' (تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی ۲۴۸)

امین احسن اصلاحی
ترتیب و تدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء

(أَسْمَاءُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حَدَّثَنِیْ عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لِيْ خَمْسَةُ أَسْمَاءٍ: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَ أَنَا أَحْمَدُ وَ أَنَا الْمَاحِي الَّذِيْ يَمْحُو اللّٰهُ بِيَ الْكُفْرَ، وَ أَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِيْ وَ أَنَا الْعَاقِبُ.

محمد بن جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پانچ نام ہیں: میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، اور حاشر ہوں کہ لوگ میرے قدموں پر جمع کیے جائیں گے اور میں پیچھے آنے والا ہوں۔

وضاحت

اس روایت کے متعلق شارحین یہ کہتے ہیں کہ اس میں پانچ کی تعداد تعین کے لیے نہیں، بلکہ صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے ہے، اسی لیے صوفی حضرات کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی سو نام ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں میں سے محمد اور احمد دونام قرآن مجید میں آئے ہیں۔ آپ کا نام احمد قدیم صحیفوں میں چلا آ رہا ہے اور قرآن مجید نے اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

جہاں تک ماحی، حاشر اور عاقب کے الفاظ کا تعلق ہے، تو یہ اسم یا نام نہیں، بلکہ صفات ہیں۔ اسم کسی ذات کو متعین طریقے پر بتاتا ہے اور اس کے ساتھ صفات کا ربط جوڑا جا سکتا ہے اور وہ اسم ان صفات کا موصوف بن سکتا ہے، لیکن کسی شخص کی صفت کو اس کا نام قرار دینا صحیح نہیں، ورنہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت تو بالمومنین رؤف رحیم بھی ہے۔ اگر صفت کی بنیاد پر حضور اپنا نام بتاتے تو آپ یہ فرماتے کہ میرا نام رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے اور یہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں خاتم النبیین کی صفت بھی حضور کے لیے آئی ہے۔ آپ اس کو بھی اپنا نام قرار دے سکتے تھے، لیکن اس روایت کی رو سے آپ نے چند بے معنی الفاظ کو تو اپنا نام بتا دیا، لیکن بامعنی الفاظ کو نہیں بتایا، حالاں کہ وہ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ 'حاشر' کہ جس کے قدموں پر لوگ جمع کیے جائیں گے، بالکل من گھڑت بات ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے: 'يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَا ذَآ اُجِبْتُمْ'*، جس روز تمام رسولوں کو، جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں، اللہ تعالیٰ اکٹھا کرے گا تو ان سے پوچھے گا کہ تم نے کیا دعوت دی تھی اور تمھاری قوم نے کیا جواب دیا تھا؟ تو سب کہیں گے کہ آپ نے جو فرمایا تھا، وہ ہم نے کہا۔ باقی ہماری قوموں نے جو کیا، وہ ہمیں نہیں معلوم۔ انھوں نے جو کچھ کیا، آپ جانتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ بہترین موقع تھا جہاں اللہ تعالیٰ بتا دیتا کہ میں لوگوں کو رسولوں کے قدموں پر جمع کر دوں گا، لیکن وہاں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام انبیا و رسل کو اکٹھا کرے گا۔ 'عاقب' سے زیادہ موزوں لفظ 'خاتم' تھا، کیونکہ قرآن مجید میں آپ کے لیے 'خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ'** کا لفظ آیا ہے۔ باقی رہ گیا کہ آپ کفر کو مٹانے والے ہیں، اس لیے آپ کا نام 'ماحی' ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بھی فعل سے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، اسم نہیں بن سکتا۔ اگر ہر فعل سے اسم بنانے لگیں تو اس میں بہت خطرے ہیں۔ مثلاً نعوذ باللہ، اس طریقہ سے آپ اللہ تعالیٰ کا نام 'مُضِلٌّ' بھی رکھ سکتے ہیں اور 'ماکر' بھی، کیونکہ قرآن میں 'يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ'*** اور 'يَمْكُرُ اللّٰهُ'**** بھی آیا ہے۔ یہ بہت خطرناک طریقہ ہے اور لوگوں نے یہی غلطی کی بھی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آپ اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کے نام نہیں

* المائدہ ۵:۱۰۹۔

** الاحزاب ۳۳:۴۰۔

*** النحل ۱۶:۹۳۔

**** الانفال ۸:۳۰۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رکھ سکتے۔ قرآن مجید میں اس کی ممانعت آئی ہے۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ — محمد اور احمد — اللہ تعالیٰ نے خود بتائے ہیں۔آپ کے یہی دو نام ہیں۔ باقی آپ کی جتنی صفات یا جتنے افعال ہیں، ان سے آپ کے نام نہیں بن سکتے۔

یہ روایت ابن شہاب کے ذریعہ سے آئی ہے اور بالکل غلط ہے۔

(تدبر حدیث ۲/ ۵۴۳-۵۴۴)

''آدمی جب بھوکا پیاسا ہو تو قاعدہ ہے کہ اس کا غصہ بڑھ جایا کرتا ہے۔ جہاں کوئی بات ذرا بھی اس کے مزاج کے خلاف ہوئی، فوراً اس کو غصہ آ جاتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے یہ چیز بھی ہے کہ جن کی طبیعتوں میں غصہ زیادہ ہو، وہ روزے کے ذریعہ سے اپنی طبیعتوں کی اصلاح کریں، لیکن یہ اصلاح اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب آدمی روزے کو اپنی طبیعت کی اس خرابی کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اگر وہ اس کو اپنی طبیعت کی اصلاح کا ذریعہ نہ بنائے تو اس بات کا بڑا اندیشہ ہے کہ روزہ اس پہلو سے اس کے لیے مفید ہونے کے بجائے الٹا مضر ہو جائے، یعنی اس کی طبیعت کا اشتعال کچھ اور زیادہ ترقی کر جائے۔ جو شخص اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ جب اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو یا کوئی دوسرا اس کے اندر اس اشتعال کو پیدا کرنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اس بات کو یاد کرے کہ 'اَنَا صَائِمٌ' (میں روزے سے ہوں)، اور یہ چیز روزے کے مقصد کے بالکل منافی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کو غصے پر قابو پانے کی تربیت ملتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ تربیت اس کے مزاج کو بالکل بدل دیتی ہے، یہاں تک کہ اس کو اپنے غصے پر اس حد تک قابو حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کو وہ وہیں استعمال کرتا ہے جہاں وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔'' (تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی ۲۴۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اِس کے لیے 'صوم' کا لفظ آتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اُس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود و قیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اِسی کو روزہ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کا جذبۂ عبادت جب اُس کے عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ روزہ اِسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اِس طرح گویا زبان حال سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اُس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون و چرا اِس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

اللہ کی عظمت و جلالت اور اُس کی بزرگی اور کبریائی کے احساس و اعتراف کی یہ حالت، اگر غور کیجیے تو اُس کی شکرگزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسی بنا پر روزے کو خدا کی تکبیر اور شکرگزاری قرار دیا اور فرمایا ہے کہ اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اِس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے جو ہدایت اِس مہینے میں تمھیں عطا فرمائی ہے اور جس میں عقل کی رہنمائی اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کے لیے واضح اور قطعی حجتیں ہیں،

اُس پر اللہ کی بڑائی کرو اور اُس کے شکر گزار بنو۔

اِس کا منتہاے کمال یہ ہے کہ آدمی روزے کی حالت میں اپنے اوپر مزید کچھ پابندیاں عائد کر کے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اِسے اعتکاف کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ و نماز اور تلاوت قرآن کے امتزاج سے جو خاص کیفیت اِس سے پیدا ہوتی اور نفس پر تجرد و انقطاع اور تبتل الی اللہ کی جو حالت طاری ہو جاتی ہے، اُس سے روزے کا اصلی مقصود درجۂ کمال پر حاصل ہوتا ہے۔

روزے کی تاریخ

نماز کی طرح روزے کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ روزہ مسلمانوں پر اُسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح وہ پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تربیت نفس کی ایک اہم عبادت کے طور پر اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روزے کا مقصد

اِس کا مقصد قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کر لیں۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے کا قانون

اِس کا قانون درج ذیل ہے:

روزے کی نیت سے اور محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ تعلق سے اجتناب ہی روزہ ہے۔

یہ پابندی فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک ہے، لہٰذا روزے کی راتوں میں کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا بالکل جائز ہے۔

روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا ہے، اِس لیے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُس پر فرض ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

بیماری یا سفر کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کے باعث آدمی اگر رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے تو لازم ہے کہ دوسرے دنوں میں رکھ کر اُس کی تلافی کرے اور یہ تعداد پوری کر دے۔

حیض و نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ تاہم اِس طرح چھوڑے ہوئے روزے بھی بعد میں لازماً پورے کیے جائیں گے۔

روزے کا منتہاے کمال اعتکاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو اِس کی توفیق دے تو اُسے چاہیے کہ روزوں کے مہینے میں جتنے دنوں کے لیے ممکن ہو، دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں گوشہ نشین ہو جائے اور بغیر کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔

آدمی اعتکاف کے لیے بیٹھا ہو تو روزے کی راتوں میں کھانے پینے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن بیویوں کے پاس جانا اُس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ اعتکاف کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اِسے ممنوع قرار دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

’’قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ روزے کی حالت میں بہت سے دنیاوی مشاغل کا بوجھ روزہ دار کے اوپر سے اترا ہوا ہوتا ہے اور نفس کے میلانات و رجحانات میں... روزے کے سبب سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاموشی، خلوت، غیر ضروری مصروفیتوں سے علیحدگی اور ترک و انقطاع کی ایک مخصوص زندگی، جو روزہ دار کو حاصل ہوتی ہے، قرآن کی تلاوت اور اس کے تدبر کے لیے کچھ خاص موزونیت رکھتی ہے۔‘‘

(تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی ۲۴۶)

’’شہوات اور خواہشات نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے، اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے، بالخصوص تزکیۂ نفس کے جتنے طریقے بھی صحیح یا غلط، دنیا میں اب تک اختیار کیے گئے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے آداب وشرائط، اسلام کی نسبت سے زیادہ سخت تھے۔ اسلام دین فطرت ہے، اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں، جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔‘‘ (تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی ۲۳۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

’’روزے سے انسان کے اندر جذبۂ ایثار کی بھی پرورش ہوتی ہے اور یہ جذبہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات میں سے ایک ہے جن سے ہزاروں نیکیوں کے لیے اس کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب روزے میں بھوکا پیاسا رہتا ہے اور اپنی دوسری خواہشوں کو بھی دبانے پر مجبور ہوتا ہے تو اس طرح اسے غریبوں، فاقہ کشوں، محتاجوں اور مظلوموں کے دکھ درد اور ان کے شب وروز کا اندازہ کرنے کا بذات خود موقع ملتا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس کا مزہ چکھ کر بھوکوں اور پیاسوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر قدرتی طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔ روزے کا یہ اثر ہر شخص پر اس کی استعداد وصلاحیت کے اعتبار سے پڑتا ہے، کسی پر کم پڑتا ہے، کسی پر زیادہ۔ لیکن جس شخص کے روزے میں روزے کی خصوصیات موجود ہیں، ان پر روزے کا یہ اثر پڑتا ضرور ہے۔ جن کا جذبۂ ایثار کمزور ہوتا ہے، روزہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی متحرک کر دیتا ہے اور جن کے اندر یہ جذبہ قوی ہوتا ہے، ان کے لیے تو روزوں کا مہینا اس جذبہ کو ابھرنے کے لیے گویا موسم بہار ہوتا ہے۔‘‘

(تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی ۲۴۵)

ڈاکٹر عدیل احمد

دین یا لادینیت ـــــ ایک عقلی جائزہ

’’ایک ذرے کا عدم سے وجود میں آنا اسی قدر وضاحت طلب ہے جتنا کہ اس پوری کائنات کا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابتدائیہ

کچھ لوگ خدا کو مانتے ہیں اور کچھ لوگ خدا کو نہیں بھی مانتے، لیکن ایسے لوگ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔ عام طور پر جن لوگوں کے بارے میں یہ تاثر قائم کر لیا جاتا ہے کہ وہ دہریے ہیں، ان میں سے زیادہ تر کسی نہ کسی شکل میں خالق کے وجود کے کسی نہ کسی نظریے پر ضرور یقین رکھتے ہیں، چاہے وہ ہمارے عقائد سے کتنا ہی متصادم کیوں نہ ہو۔ ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی اپنی اپنی وجوہات ہیں، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ ماننے والوں میں سے ہیں یا نہ ماننے والوں میں سے یا یوں کہہ لیجیے کہ انھوں نے اپنے لیے ایمان یا تکفیر کا فیصلہ کرنے کی کوئی شعوری کوشش کبھی کی ہی نہیں۔ زیر نظر مضمون خاص طور پر ایسے ہی لوگوں سے مخاطب ہے، لیکن عمومی لحاظ سے یہ سب ہی کو خطاب کرتا ہے۔ ایمان رکھنے والوں کے لیے ہم اپنا نقطۂ نظر اور الوہیت، توحید، رسالت اور آخر میں اسلام کے حوالے سے خالص منطقی معروضات پیش کریں گے، جبکہ ایمان نہ رکھنے والوں کے لیے ان کے اس رویے کی عمومی وجوہات سے بحث کی جائے گی۔ اتفاق یا اختلاف کرنا آپ کا حق ہے، لیکن ہمارا مقصد فقط اتنا ہے کہ اس موضوع کا، جو زاویۂ فکر کی ایک ذرا سی تبدیلی سے زندگی کا سب سے اہم موضوع بن جاتا ہے، پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور اس کے بارے میں اپنی رائے ٹھوس بنیاد پر اٹھائی جائے۔ اس گفتگو میں ہم تکنیکی اصطلاحات اور مذہبی حوالوں سے گریز کریں گے تاکہ بات نہ صرف یہ کہ عام فہم ہو، بلکہ حتی

الامکان اس میں کسی قسم کی جانب داری کا تاثر بھی نہ آنے پائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اپنی اس گفتگو کو سہل اور رواں بنانے کے لیے ہم دین، فلسفے اور سائنس کی ادق کتابوں کو اپنا ماخذ بنانے اور جا بجا ان کے حوالوں سے قاری کے تسلسل کو توڑنے کے بجاے اپنے قاری کی عمومی سمجھ بوجھ (common sense) پر زیادہ انحصار کریں اور اپنی معروضات کے حتمی فیصلے اسی پر چھوڑ دیں۔اس کے باوجود کہیں کہیں ایسے حوالے ناگزیر ہوں گے۔

اس مضمون کے چار حصے ہیں۔ ہر حصہ ایک سوال کو خطاب کرتا ہے۔ پہلے حصے میں اس سوال سے بحث کی گئی ہے کہ کیا ہمارا اور اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا یہ خود بخود بن گئی ہے؟ ہماری کوشش ہے کہ ہم بہت لمبی اور مشکل بحثوں میں الجھے بغیر سہل اور عام فہم انداز میں ایسی منطقی دلیلوں کے سہارے، جو کسی عالم اور ایک متجسس ذہن کے مالک عام آدمی کو ایک سا متاثر کرتی ہوں، اپنے پڑھنے والوں کی عمومی سمجھ بوجھ کو اپیل کریں اور اس سوال کے جواب میں اپنا نقطۂ نظر قائم کریں۔اگر قاری اس پہلے حصے کے اختتام پر ہم سے متفق نہیں ہوتا تو ضروری نہیں ہے کہ وہ مضمون کے دوسرے حصے کی طرف بڑھے۔ ہاں، اگر یہاں ہم ایک اتفاق راے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اگلا سوال ہوگا: کیا ہمارے اور ہماری اس کائنات کے کئی خالق ہیں یا ہر طرح کی مخلوق کا ایک ہی خالق ہے؟ یعنی الوہیت کے بعد ہم توحید پر بات کریں گے۔ اگر یہاں بھی ہم اپنے قارئین کو اپنے زاویۂ فکر پر قائل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو اگلا سوال رسالت سے متعلق ہے کہ کیا خالق اپنی ذی شعور مخلوق کے لیے کوئی پیغام ہدایت بھیجتا ہے یا نہیں؟ اس مختصر سی بحث سے گزرنے کے بعد ہم آخری سوال پہ پہنچیں گے کہ کیا خالق کا آخری پیغام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آئے ہیں؟ یہاں آخری سے مراد ابھی تک کا آخری بھی ہے اور حتمی اور خاتم بھی۔مضمون کے اس حصے میں سوال کے یہ دونوں ہی رخ زیر بحث آئیں گے۔ان چار بنیادی نکات کے طے کرنے کے لیے ہمیں چند ذیلی امور پر بھی بحث کرنا ہوگی۔ یہ تمام موضوعات ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہیں کہ ایک کی وضاحت کے بغیر دوسرے پر بات مناسب نہیں اور دوسرے پر اتفاق کیے بغیر تیسرے موضوع کو کھولنا صحیح نہیں ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ سلسلہ وار گفتگو کریں اور اپنی بات میں تسلسل اور روانی قائم رکھنے کے لیے بحث کے ہر زینے پر پہنچتے ہوئے گذشتہ مرحلوں کا اعادہ کریں۔اسی باعث آپ کو کچھ باتوں کی تکرار بھی ملے گی جو مرحلہ وار ترتیب اور موضوعات کے تعلق کو نبھانے کے لیے ناگزیر ہے۔

ہم اپنے پڑھنے والوں سے درخواست کریں گے کہ اس مضمون کے مطالعے سے پہلے کوشش کریں کہ نظر کی عینک کے علاوہ اور ہر طرح کی عینک اتار کر رکھ دیں۔ ہماری گزارشات کھلے دل اور بے تعصب ذہن کے ساتھ پڑھیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہمارا کوئی نکتہ اگر آپ کی مطالعاتی تربیت، نظریات یا عقیدوں سے کہیں متصادم ہو تو فیصلہ اپنی غیر جانب دار سمجھ بوجھ اور انصاف کے تقاضوں کے ماتحت کریں اور اس پر اپنی پہلے سے قائم شدہ سوچ کو اثر انداز مت ہونے دیں۔

ہمارے انداز تحریر سے اگر کسی قاری کے جذبۂ عقیدت کو یا کسی کے مذہبی (یا غیر مذہبی) احساسات کو ٹھیس پہنچتی ہو تو ہم ان سے معذرت کے طلب گار ہیں۔ ہمارا مدعا فقط یہ ہے کہ اپنی معروضات کو نہایت بے لاگ طریقے سے پیش کریں اور اپنی تحریر پر عقیدت واحترام یا نفرت وحقارت کے وہ رنگ نہ چڑھنے دیں جن سے اس کا غیر جانب دارانہ انداز متاثر ہو اور متذکرہ بالا سوالات سے متعلق مروجہ نظریات کو منطق اور عمومی سوجھ بوجھ کی کسوٹی پر پرکھنے کے عمل کو نقصان پہنچے۔ اس مقدمے کے لیے چونکہ ہم نے دلیل کو اور اپنے پڑھنے والوں کی عمومی سمجھ بوجھ کو خطاب کیا ہے، لہٰذا اپنی بات سمجھانے کے لیے متعدد مثالوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ممکن ہے، ان مثالوں کے انتخاب میں یا گفتگو کو مذہبی رنگ سے بچا کر ایک عام فہم انداز دینے کے لیے الفاظ اور جملوں کے استعمال میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہو، اس کے لیے بھی ہم معذرت خواہ ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الوہیت

انکار کی وجوہات

غیر مذہبی لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان افراد پر مشتمل ہے جو دنیا میں ہر طرف ظلم اور بے انصافی دیکھ کر ایک عادل اور قادر خدا کے وجود سے منکر ہو جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسی ہستی کے ہوتے ہوئے جو ہر شے اور ہر واقعے کی مکمل خبر رکھتی ہو، اور پھر کچھ بھی اس کے دائرۂ قدرت سے باہر نہ ہو، دنیا میں وسائل کی ایسی غیر منصفانہ تقسیم ہو، ظالم ترین لوگ مکافات عمل سے بچ نکلتے ہوں اور بے شمار لوگ کسی فریادرسی کے بغیر ظلم اور جبر کی چکی میں پستے پستے عمر گزار دیں۔ ایسے حضرات (وخواتین) کی انسان دوستی قابل تحسین ہے، لیکن انکار کی یہی وجوہات زاویۂ فکر کے ایک ذرا سے فرق کے ساتھ اقرار کی دلیل بن سکتی ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر اس دنیا میں ہر معاملہ انصاف و مساوات پر قائم ہو جائے تو کسی منصف یا حاکم کی کیا ضرورت باقی رہے، خالق کے وعدے کے مطابق حساب کا دن کس لیے سجے اور جزا اور سزا کیوں عمل میں آئے۔

انکار کی وجہ اگر ضد ہو تو اس کا علاج بہت مشکل ہے، ورنہ علم کے ساتھ اگر فکر کا ایسا درست زاویہ میسر آ جائے جو کسی سبب یا اثر کے بوجھ سے کسی بھی طرف جھک نہ رہا ہو تو خالق کے وجود سے انکار کی باقی تمام وجوہات کا جواب ممکن ہے،

خواہ وہ احساس کم تری پر بنیاد رکھتی ہوں، لاعلمی پر مبنی ہوں، دنیا میں پائی جانے والی معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں سے پھوٹتی ہوں، تاریخ کی ادھوری کہانیوں کے انجام تلاش کرتی ہوں یا وسائل اور مواقع کے عدم توازن سے ابھرتی ہوں۔

ان تمام وجوہات میں سے احساس کم تری باقی سب سے الگ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام عوامل تو اس دنیا میں چلنے والی فلم کے انٹرول (interval) سے پہلے کے حصے سے مماثل قرار دیے جا سکتے ہیں جس میں سارے کام غلط ہو رہے ہوتے ہیں اور چیزوں کا ٹھیک ہو جانا بظاہر ناممکن سا لگتا ہے، لیکن وقفے کے بعد کی کہانی میں سب کچھ درست ہو جاتا ہے۔ ہمیں صرف یہ سمجھنا ہے کہ دنیا کی اس فلم کا انجام موت نہیں ہے، بلکہ موت صرف وہ انٹرول ہے جس کے بعد باقی کا حصہ چلنا ہے۔ پیچھے رہی مرعوبیت یا کم تری کا احساس، تو یہ ان لوگوں کے لیے انکار یا تشکیک کا باعث بنتا ہے جو غیروں کی فلاسفی اور تحقیق سے ازحد متاثر ہو کر اپنے دین اور اپنی ثقافت کو سمجھے بوجھے بغیر ان کے خلاف فیصلہ دے دیتے ہیں۔ مشورہ ان کے لیے بھی وہی ہے، علم اور بے تعصب انداز فکر!

کچھ احباب ایسے بھی ہیں جو کسی الہامی دین کو ماننے پر اس لیے تیار نہیں ہیں، کہ ان کی دانست میں مذہب سوچ پر پہرے بٹھاتا ہے، انسان پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور اسے غلام بنا دیتا ہے۔ اگر اس سلسلے میں بھی بے لاگ سوچ سے کام لیا جائے تو حقیقتاً معاملہ بالکل الٹ ہے۔ عرب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایک ایسا نام نہاد معاشرہ جو اپنے ہر فعل اور ہر فیصلے کے لیے الگ الگ خداؤں کا محتاج تھا، جب دین میں داخل ہوا تو دین کے انھی پہروں اور پابندیوں نے اپنے نظم میں کس کر اس کی سوچ کو ایسی آزادی اور شعور بخشا کہ وہ ذلت و جہالت کے اندھیروں سے نکل کر دنیا کے لیے علم و عرفان کی مشعلیں روشن کرنے لگا۔ مذہب تو دراصل ہمیں ان پابندیوں سے آزاد کرتا ہے جو ہمارے اپنے توہمات ہم پر عائد کرتے ہیں۔ آخری دین (اور پہلے اور واحد دین بھی) کی تو ابتدا ہی ہر قسم کے وہم و گمان اور بدعقیدگی کی نفی سے ہوتی ہے۔ ہاں، اگر اپنے حقیقی خالق کو بھی نہ پہچان پائے تو ہم اسے سوچ کی آزادی نہیں، بلکہ کجی قرار دیں گے۔

خدا کے وجود کے لیے ایسے ثبوت فراہم نہیں کیے جا سکتے کہ جو ہماری حسیات کے دائرۂ عمل میں آ سکتے ہوں۔ معلوم الوہی ادیان کے مطابق خدا کی ذات کا علم غیب سے تعلق رکھنے والے ان تمام امور میں سب سے اولیٰ ہے جو کسی بھی طرح حیطۂ حس و ادراک میں نہیں سما سکتے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خدا کے عدم وجود کے لیے بھی کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ موخر الذکر، اول الذکر سے محال تر ہے۔ چنانچہ ہمیں اس بحث کا فیصلہ انسانی شعور اور فہم کی طاقت کے بلا امتیاز استعمال پر چھوڑنا ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

خدا کے تصور سے انکار کی سب سے بڑی وجہ عام طور پر علم کو سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اور اس انداز فکر کی وجہ علم نہیں، بلکہ لاعلمی ہے۔ ممکن ہے، میرے کچھ پڑھنے والے یہاں مجھ سے اختلاف کریں، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے اس بیان کے پیچھے کوئی تعصب یا طنز پوشیدہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ الحاد پسندوں کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جو بظاہر خاصے تعلیم یافتہ اور مطالعے کے شوقین ہوتے ہیں اور دوسری طرف ایمان رکھنے والوں میں جہاں بہت سے لوگ بے حد پڑھے لکھے اور ذہین ہوتے ہیں، وہیں جہلا کی بھی ایک کثیر تعداد ان کے ساتھ عقیدوں کا اشتراک رکھتی ہے۔ لیکن یہاں دو نکات کی وضاحت ضروری ہے: ایک تو یہ کہ اگر ہمیں اجازت دیں تو ایک جاہل شخص کے ایمان کو ہم تقلید کہنا زیادہ درست خیال کریں گے، کیونکہ اس کا عقیدہ کسی علم، منطق، تعلیم یا سمجھ بوجھ کی ایسی کسی مشق کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ تر دیکھا دیکھی اور سنی سنائی کا تسلسل ہوتا ہے۔ یہاں ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایمان بالغیب کے لیے آپ کا ان چیزوں کو سمجھنا ضروری ہے جن پر ایمان لا رہے ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک تو غیب کا لفظ ہی ان امور کا احاطہ کرتا ہے جنھیں آپ کسی بھی طور سمجھ نہیں سکتے، لیکن آپ کو بہر حال یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون سی باتیں ہیں جنھیں آپ سمجھ سکتے، اور کیوں نہیں سمجھ سکتے، اور جن پر ایمان لانا آپ کے ایمان والا ہونے کے لیے لازمی ہے۔

دوسرے زیادہ معلومات رکھنے کا مطلب زیادہ علم کا ہونا نہیں ہے۔ اعداد و شمار اور شماریات جب کسی مقصد کا ارتکاز بھی رکھتے ہوں تو انھیں معلومات کہا جاتا ہے، اور معلومات کے ساتھ جب سمجھ بوجھ شامل ہو جائے تو یہ علم کے درجے پر فائز ہو جاتی ہیں۔ علم تعصب کے دروازے سے کم ہی گزرتا ہے۔ سیکھنے کی خاطر مطالعے، مشاہدے یا تجربے کے اوزاروں کو جب تک صاف دلی اور عدم امتیاز کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے، وہ ہمیں درست سبق دینے کے بجائے صرف وہ نتائج فراہم کرتے ہیں جو کسی نہ کسی طور، اور کسی نہ کسی حد تک ہمیں مطلوب ہوتے ہیں۔ لوگ مذہبی کتابوں اور انبیا کے اقوال سے ہی نہیں، بلکہ سائنسی مشاہدات سے بھی اپنی مرضی کے مطالب اخذ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں تحقیقی عمل کے لیے بے لاگ ہونا ایک کڑی اور لازمی شرط ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر تحقیقات کسی نہ کسی مفاد کے زیر سایہ یا پہلے سے قائم کیے گئے کسی ادھ پکے نظریے کے ہم قدم تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ یہ تو خیر ایک ضمنی بحث ہے، ورنہ جو نکتہ ہم قائم کرنا چاہ رہے ہیں، وہ اس قدر ہے کہ تعصب اور شدت کا جو الزام انتہائی آسانی کے ساتھ مذہبی لوگوں یا ایمان بالغیب کا عقیدہ رکھنے والوں پر جا چپکتا ہے، وہ اصل میں الحاد پسندوں کے لیے بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا ہی موزوں ضرور ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یک طرفہ فیصلہ

اِن پڑھے لکھے لوگوں کی الحاد پسندی کا، جن کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ زیادہ علم نے انھیں دین سے دور کر دیا ہے، ایک پہلو تو ان کا یک رخا مطالعہ یا حصول علم ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم تعداد ایسے افراد کی ہے جو ایمان اور الحاد کے مقدمے میں اپنا فیصلہ فریقین کا بیان سننے کے بعد دیتے ہوں، ورنہ عام طور پر ان لوگوں نے اول تو ایمان سے متعلق کچھ پڑھنے، سمجھنے یا جاننے کا تکلف کیا ہی نہیں ہوتا یا پھر ان کی یہ کوشش چند ایسے کتابچوں، روایتوں اور کہانیوں پر مشتمل ہوتی ہے جن سے دین اور ایمان کی اصل کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایک طرف اگر پلیٹو اور ارسٹوٹل کے ملفوظات کے تراجم کی درستگی اور ایڈیشن کی تاریخ کے بارے میں انتہائی محتاط ہوتے ہیں تو دوسری جانب کسی بھی ڈاڑھی والے کی بتائی ہوئی بات کو یا قصے کہانیوں کی سی اسرائیلی روایات اور تشہیری کتابچوں میں لکھی ہوئی بے سند اور بلا حوالہ تحریروں کو ازحد آسانی سے دین و ایمان کی نمائندگی کا درجہ دے دیتے ہیں۔

دوسرا پہلو زاویہ نظر کی وہ عینک ہے جو صرف انھی نے نہیں، بلکہ ایسے تقریباً تمام ہی لوگوں نے لگا رکھی ہے جو کسی نظریے کے ماننے والے ہیں۔ یہی عینک ہے جو اکثر مذہبی لوگوں کو دین کا دائرہ اتنا تنگ اور چھوٹا دکھاتی ہے کہ انھیں ہر دوسرا مسلمان اس دائرے سے باہر کھڑا نظر آتا ہے۔ انسان شاید اپنے عقیدے اور اپنی perception سے مطلقاً علیحدہ ہو کر اپنے مطالعے، مشاہدے یا تجربات کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ایک سلیم الفطرت اور صاحب ایمان شخص کی عینک اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کا دائرۂ نظر نسبتاً وسیع ضرور ہوتا ہے، وہ اس لیے کہ اس کے ارتکاز کا مرکزی نکتہ اپنے مقام کے طفیل دیگر تمام نقطہ ہاے نظر کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ بیان ہمارے کچھ پڑھنے والوں کی پیشانیوں پر بل ضرور ڈالے گا، لیکن زیر نظر مضمون ایک اعتبار سے اس بیان کی ایک بالواسطہ وضاحت بھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے مطالعے سے کسی نہ کسی حد تک ضرور یہ تاثر ڈھل جائے گا کہ ''مذہبی لوگ'' بہت تنگ نظر ہوتے ہیں اور شاید غیر مذہبیت اور وسیع الخیالی کو جو عام طور پر ہم معانی سمجھا جانے لگا ہے، اس خیال کی بھی کچھ اصلاح ہو سکے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نارمل اور عادی

جن عوامل کو ہم آنکھ کھولتے ہی دیکھتے چلے آتے ہیں، ان کے لیے انگریزی میں عام طور پر ''نارمل'' (normal) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ انھیں (زیادہ درست طور پر) کسٹم (custom) بھی کہا جاتا ہے، لیکن نارمل زیادہ وسیع معنوں میں اور زیادہ کثرت سے مستعمل ہے۔ نارمل کو اردو میں عمومی، حسب معمول، حسب دستور یا حسب عادت کہا جا سکتا ہے، جو دراصل ایسے عوامل کے لیے زیادہ مناسب الفاظ ہیں۔ عربی میں نارمل کو عادی کہا جاتا ہے۔ ان معنوں

کے لیے، عادی سب سے زیادہ درست لفظ ہے۔

اگر یہ گفتگو آپ کو لاتعلق محسوس ہو رہی ہے تو بس تھوڑا سا تحمل کریں، ابھی اس بحث کا رشتہ اس مضمون کے مرکزی خیال سے جڑ جائے گا۔ جو نکتہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ معمولی اور غیر معمولی کے اس فرق سے متعلق ہے جو عام طور پر گردانا جاتا ہے۔ عموماً، سمجھ میں آنے والی، اپنے پیچھے اسباب و وجوہ کا ایک تسلسل رکھنے والی باتوں کو نارمل کہا جاتا ہے، لیکن اگر کسی بھی حرکت یا عمل کا سبب سمجھنے کے لیے کیے جانے والے سوالات کا سلسلہ کچھ اور دراز کیا جائے تو ایک مقام آئے گا جہاں کوئی بھی چیز نارمل نہیں رہ جائے گی۔ اس اعتبار سے عادی یا حسب معمول کی اصطلاحات زیادہ درست معلوم ہوتی ہیں کہ صدیوں سے جو کام جس طرح انجام پاتے آ رہے ہیں، انھیں اسی طرح ہوتے دیکھنے کی عادت نے ان کا غیر معمولی پن اور اچنبھا ختم کر دیا ہے، ورنہ دنیا میں ہونے والا کوئی بھی فعل پوری طرح سمجھ میں آنے والا اور معمولی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آگ لکڑی کو جلاتی ہے اور جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ہمیں اس سارے عمل میں کوئی حیرت انگیز، ناقابل فہم یا غیر معمولی چیز نظر نہیں آتی، لیکن کیا واقعی یہ سارا عمل ایسا ہی سادہ اور قابل فہم ہے یا ہم نے اس کے پیچھے کارفرما امور کو سمجھنے کے بجاے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لینے پر اکتفا کر لیا ہے، ورنہ لکڑی کے جلنے کے میکانزم میں تکسیدی عمل تک پہنچ جانے کے بعد ایک آدھ ''کیوں'' اور ہو تو ہمارے علم اور فہم کی بے بسی کے لیے کافی ہو جائے گا۔ سادہ الفاظ میں یوں کہیے کہ آگ کا جلانے کا عمل اپنی اصل کے اعتبار سے آج بھی ایسا ہی چونکا دینے والا اور غیر معمولی ہے، جیسا کہ اس پہلے انسان کے لیے رہا ہو گا جس نے اس کا اولیں مشاہدہ کیا تھا، لیکن قرن ہا قرن سے اسے دیکھتے چلے آنے، اس کے پیچھے کارفرما عوامل کو دریافت کر لینے (خیال رکھیے گا کہ یہاں ہم نے دریافت کا لفظ استعمال کیا ہے سمجھ کا نہیں)، اور ان عوامل کو اپنے بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد ہم اس کو معمولی اور نارمل سمجھنے لگے ہیں۔

آگ کے جلانے کے عمل کے علاوہ کوئی بھی اور مثال لے لیجیے، وہ پانی کے بہنے کی، چیزوں کے اس میں ڈوبنے یا اس پر تیرنے کی عادت ہو، پرندوں کے ہوا میں اڑنے کی صلاحیت ہو یا کوئی اس سے بھی زیادہ معمول کی بات، یعنی اچھالنے پر پتھر کے واپس زمین پر آ گرنے کی بات ہو، ذرا سا غور کرنے پر آپ اس کا غیر معمولی پن دریافت کر لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ توجیہ جو آپ معلوم کر سکیں گے، وہ کسی بھی طبعی یا طبیعی قانون کا سہارا ہو گا، جیسے کہ کشش ثقل کا قانون، حرکت کے قوانین یا پھر ارشمیدیس یا پاسکل کے قوانین وغیرہ، لیکن یہ قانون اس طرح کیوں ہے؟ اس کی کوئی وضاحت پانا ممکن نہیں۔

معمے اور اصطلاحات وقوانین

یہاں ایک ضمنی جملہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سائنس شاید صرف 'کیا' اور 'کیسے' کا جواب پا سکتی ہے، 'کیوں' اس کے حیطۂ عمل سے باہر ہے۔ اس 'کیوں' سے نمٹنے کے لیے روایتی دینی علما کی طرح سائنسی علما نے بھی تھیوری اور قانون کی دیواریں اٹھائی ہیں اور اصطلاحات کے بند باندھے ہیں۔ وقت کا معما نہیں سلجھا تو زیرو ٹائم، تخلیق کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا تو creativity field یا physical singularity، کائنات کے توازن اور مادے کی مقدار میں اعتدال کی مساوات ڈگمگائی تو dark matter پیدا کر لیا گیا۔ الغرض، سوالات کی ان پیچیدہ اور تاریک راہوں میں سائنس جہاں تک اپنے تجسس اور طریقۂ کار کی مشعلیں اٹھائے چل سکی ہے، چلی ہے، لیکن جہاں اندھیرا اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ ان مشعلوں کی لو جواب دے جائے، وہاں سائنس نے کسی ایک اصطلاح کا بورڈ ٹھونک دیا ہے اور اس سے آگے کے راستے کو اپنے لیے غیر متعلق قرار دے دیا ہے۔ ہمیں اس روش پر اعتراض نہیں ہے، اور نہ ہی ہم ان جواب طلب سوالوں کے حتمی جواب دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہمارا نکتہ یہ ہے کہ اس حوالے سے سائنس کی نئی روشنی کے علم برداروں اور ہمارے محترم دینی علما کا احوال ایک سا ہے، یعنی ایک طرف اگر منطق وفکر، بلکہ یہاں تک کہ بعض معاملات زندگی کے دینی پہلوؤں سے متعلق استفسارات پر روایت اور تقلید کا، اور اپنی ہی اختراع کی ہوئی اصطلاحات کا پہرا ہے تو دوسری طرف بھی سوچ کے افق پر مفروضات کے بلیک ہولز منڈلا رہے ہیں۔

ضمنی جملے کا ضمیمہ کچھ طویل ہو گیا، ورنہ بات ہو رہی تھی اس امر کی کہ اس دنیا میں ہونے والا کوئی عمل، کوئی وجود اور کوئی مشاہدہ معمولی نہیں ہے۔ آگ، پانی، ہوا کی خصوصیات، مادے کی ماہیت، روشنی کی تعیین، کشش اور دفع کی قوتیں، ستاروں کی گردش وغیرہ کو تو چھوڑیے، ہم ابھی تک خود سے تعلق رکھنے والی سب سے بنیادی حقیقتوں، یعنی زندگی اور موت کی گتھی نہیں سلجھا سکے ہیں۔ چنانچہ خدا کے وجود کے نظریے کو صرف اس بنا پر رد کر دینا کہ وہ ہمارے شعور وادراک سے باہر ہے یا حسی تجربات سے ماورا ہے، قرین انصاف نہیں ہے۔ یا تو ہم کائنات کا ہر راز صرف جان ہی نہیں، بلکہ سمجھ بھی چکے ہوں اور ہر عمل کے پیچھے کارفرما محرکات سے پوری طرح واقف ہو چکے ہوں، اور پھر خدا کا وجود تسلیم کر لینے سے ہماری ہزاروں برس کی محنت شاقہ اور ذہنی ارتقائی سفر کا حاصل خاک میں مل جاتا ہو تو پھر بھی ہم اس نظریے کو مسترد کر دینے میں کسی حد تک حق بجانب ہیں، لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس یہ ہے کہ ہم ایک ذرے تک کا وجود سمجھنے کی کوشش میں ایک نئی کائنات کے دل میں اتر جاتے ہیں، جس قدر دریافت کرتے چلے جاتے ہیں، اپنی لاعلمی اور بے بسی اسی قدر آشکارا ہوتی چلی جاتی ہے۔ 'کیا'، 'کب'، 'کیسے' اور 'کیوں' کے سبھی راستے گہری دھند

میں اٹے ہوئے ہیں، لیکن ہم صرف 'کون' کے دروازے کو کھولے، کھٹکھٹائے بغیر اس کے پیچھے کسی کی موجودگی کا انکار اپنی تشفی کے لیے کافی سمجھتے ہیں، جبکہ یقیناً مادے، توانائی اور زندگی کی تخلیق، وقت اور تغیر کے ثبات اور طبعی قوانین کے نفاذ کا ابدی معما ایک خالق اور ایک نافذ و نفاذ کے وجود کو تسلیم کر لینے سے سلجھ جاتا ہے۔ ہاں، خود خالق کا وجود، اس کی اساس اور اس کی نوع بہر حال ایک سمجھ میں نہ آنے والا معاملہ ہے، لیکن اگر ہم خالق کو مان ہی لیتے ہیں تو پھر اس معاملے سے نمٹنے کے لیے بھی ہمیں اسی کے بیان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ خالق کی ہستی انسانی حس و ادراک سے ماورا ہے۔

مزید معمے

یوں بھی تخلیق کے معاملے میں انسان کو کسی نہ کسی زینے پر اپنے تخیل اور امکانی جدوجہد کی بے بسی ماننا ہی پڑتی ہے، تو کیوں نہ ہم کائنات کی تخلیق سے ایک قدم آگے بڑھ کر خالق کے معاملے میں ہتھیار ڈالیں۔ اور اس کی ایک مثال زندگی کی ابتدا ہے جس سلسلے میں یہی رویہ اپنایا گیا ہے۔ اس جدید دور کے بیالوجسٹس (biologists) کی ایک متفقہ رائے ہے کہ زندگی کسی بے جان شے سے جنم نہیں لے سکتی۔ اسے biogenesis یا حیات از حیات کا نظریہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پہلی بار حیات کی تخلیق ایسے عوامل کے نتیجے میں ہوئی جو ظاہر ہے کہ خود جان دار نہیں تھے، یعنی abiogenesis اور ہمیں یہ تسلیم کرتے ہوئے کسی سائنسی قانون کی بے حرمتی یا علمی بددیانتی کا احساس نہیں ہوتا کہ ایک بار تو زندگی نے بے جان اشیا سے تخلیق پائی، لیکن اس کے بعد کسی نے یہ حکم نافذ کر دیا کہ آیندہ سے ایسا کبھی نہیں ہوگا اور اب زندگی ہمیشہ زندہ چیزوں سے ہی پیدا ہوگی۔

وائرس کا حیاتی یا غیر حیاتی مقام، وقت کا خلا کے ساتھ رشتہ، روشنی کی رفتار، اور رفتار سے بڑھ کر اس کی نوعیت، یہ سب تو تسلیم شدہ معمے ہیں، اور ان سے بھی آگے کی چیزیں بلیک ہول اور ورم ہول (black holes and worm holes)، ڈارک میٹر اور اینٹی میٹر (dark matter and anti matter) اور اسی طرح کے معلوم نہیں کتنے ہی دیگر معاملات ہیں۔ انھیں چھوڑیے، ایٹم کے اندر کی دنیا، الیکٹرانز کی گردش، ہگس بوسن (higgs boson) ذرات کی ہیئت، مادے کی بنیادی اکائی اور اس کا توانائی کے ساتھ تعلق۔ ان سب کو بھی جانے دیجیے، ایک خاص درجۂ حرارت سے نیچے پانی کا سکڑنے کے بجائے پھیلنا، حیات کا تنوع، معلومات، تجربے اور احساس و جذبے کی نسلوں میں منتقلی اور ایسی بہت سی دوسری ان بوجھی پہیلیاں بھی رہنے دیں، میرے نزدیک تو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی اس دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی بات سے لے کر بڑی سے بڑی بات، ہر عمل، ہر شے، دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

والے دماغ کے لیے ایک معجزہ ہے۔ دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ خود معجزہ ہیں۔

ذرا توقف کیجیے، مجھے ان معموں کے 'کیا' اور 'کیسے' مت بتائیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ان میں سے زیادہ تر عوامل کے میکانزم سے اور زیادہ تر اشیا کی ساخت سے واقف ہیں، لیکن میرا سوال وہیں ہے کہ کیا کسی بے حد پیچیدہ مشین کی ساخت اور اس کے کام کرنے کا طریقہ سمجھ لینے سے، اس مشین کی ندرت اور اس کے خالق کا کمال، بلکہ خالق کے وجود کا تصور ختم ہو جاتا ہے؟ یہ سوال تو بہرحال وہیں رہتا ہے کہ یہ مشین جو یوں بنی ہے اور ایسے کام کرتی ہے، وہ ایسے کیوں بنی ہے اور اس طرح کیوں کام کرتی ہے۔ آخر acetylcholine کیوں اعصاب کی ایک تار کے اندر اور باہر موجود چارج کو الٹاتی ہوئی اس میں ایک پیغام کی ترسیل کو ممکن بناتی ہے؟ آخر انسانی جسم کا ایک خلیہ اس نظام کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتے ہوئے، جس کا وہ ایک خرد بینی حصہ ہے، کس طرح ایک خود مختار یونٹ کے طور پر کام کرتا ہے؟ ایک سیل (cell) کی سطح پر اس شعور کی موجودگی کیوں ممکن ہوئی کہ وہ اپنے مفسد مادوں کے اخراج اور قابل استعمال اجزا کے سنبھالنے کے لیے ایک شعبہ قائم کر سکے؟

اگر ہم اس لامتناہی کائنات میں ایک لائف زون (life zone) کے اندر اپنی موجودگی، پیچیدہ حیاتیاتی نظام، ایکو سسٹم، موسم اور زندگی کے معاون طبعی قوانین کو فقط ایک غیر شعوری اتفاق سمجھنے پر مصر ہیں تو معاف کیجیے گا یہ ایسا ہی اتفاق ہے کہ جیسے مثال کے طور پر کسی چھاپہ خانے میں زلزلہ آنے سے ایک انتہائی شان دار کتاب تیار ہو جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مثل وضد

دنیا میں موجود کوئی بھی چیز اپنی مثل سے پہچانی جاتی ہے یا پھر اپنی ضد سے۔ رنگ، ذائقے، آوازیں، اجسام، یہاں تک کہ احساسات تک اپنے سے ملتے جلتے یا مخالف اور متضاد رنگوں، ذائقوں، آوازوں، جسموں اور احساسات کے ساتھ تقابل کی وجہ سے جانے پہچانے اور سمجھے جاتے ہیں۔ روشنی اندھیرے سے ممیّز ہوتی ہے اور اندھیرا روشنی سے، آواز کا احساس خاموشی کا مرہون منت ہے اور خاموشی آواز کے تقابل سے اجاگر ہوتی ہے۔ یہ ایک گھسی پٹی بات ہی سہی، لیکن کوئی باشعور انسان اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔ ہم ایک مثال سے اپنی بات کو کچھ اور واضح کرتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک بچہ ایسے ماحول میں پیدا ہوتا ہے جہاں اس کی پیدایش سے پہلے سے کوئی آواز موجود ہے جو مسلسل ایک ہی فریکوئینسی، حجم اور روانی سے آ رہی ہے۔ نہ وہ کبھی موقوف ہوتی ہے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔ تو وہ بچہ ساری زندگی اس آواز کے ہونے کا احساس نہیں کر سکے گا، جب تک کہ اس آواز میں کوئی وقفہ یا تغیر نہیں آتا۔ اس کیفیت کا تجربہ ہم میں سے اکثر کو کسی نہ کسی حد تک ایسے مواقع پر ہوتا ہے، جب کسی جگہ ہمیں کسی مشین کی

مستقل آواز یا جنریٹر کے شور کے ساتھ رہنا پڑے۔ کچھ دیر کے بعد ہمیں اس آواز کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یہ احساس دوبارہ صرف اس وقت ہوتا ہے، جب یہ آواز کسی وجہ سے ختم ہوتی ہے اور ہمیں اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ایک مستقل humیا شور تھا جو ختم ہو گیا ہے۔غور کیجیے اگر اس آواز میں کبھی کسی ایک لمحے کے لیے نہ کوئی تبدیلی واقع ہو اور نہ کبھی کوئی وقفہ آئے، اور یہ معاملہ ہماری پیدایش، ہمارے جہان کی پیدایش سے پہلے سے چل رہا ہو تو اپنے مرتے دم تک ہم کیونکر اس آواز کے ہونے سے ہی واقف ہو سکیں گے۔ یہی صورت حال کسی بھی اور امر میں پیش آئے گی۔ کچھ بھی جو یکساں ہو، بلا تغیر ہو، مسلسل، بلکہ مستقل ہو اور دائم ہو، ہمارے حس وادراک سے ماورا ہو گا۔

قوانین فطرت

پال ڈیویز (Paul Davies) یونیورسٹی آف آسٹریلیا میں ریاضی کے پروفیسر اور ایک معروف میٹا فزسسٹ ہیں۔ وہ اپنی کتاب مائنڈ آف گاڈ (Mind of God) میں ایک طویل اور دل چسپ بحث کے بعد فطرت کے قوانین کے بارے میں چند نتائج اخذ کرتے ہیں: یہ قوانین آفاقی ہیں؛ یہ قوانین مطلق ہیں؛ یہ قوانین ہمیشہ سے موجود ہیں؛ یہ ہر جگہ لاگو ہیں؛ ہر چیز اور ہر عمل ان کے تابع ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ یہی باتیں ہم قوانین کے بجاے ان کے بنانے والے کے بارے میں کیوں نہیں کہہ سکتے؟

سائنس کے اوہام

یہاں برطانوی محقق ریوپرٹ شیلڈریک کا حوالہ بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہو گا۔ ریوپرٹ شیلڈریک نے کیمبرج یونیورسٹی سے بائیوکیمسٹری میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور پھر ہارورڈ سے سائنس کے فلسفے اور تاریخ میں ڈگری لی ہے۔ انھوں نے اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد اپنے تحقیقی کام کا اختتام کر دیا کہ سارا نظام ایک دائرے میں گھومتا ہے۔ یہ تو اتنا بھی واضح نہیں کرتا کہ تنوع کا آغاز کیسے ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ ۹ سال کی پرخلوص تحقیق و مطالعے کے بعد معلوم یہ ہوا کہ بائیوکیمسٹری کبھی اس مسئلے کا حل نہیں جان سکے گی کہ چیزوں کی بنیادی صورت ایسی کیوں ہے، جیسی کہ وہ ہے؟ ان کی ایک کتاب کا نام ہے: ''سائنسی توہمات (سائنس ہوئی آزاد)''-(The Science Delusions (Science Set Free)، یعنی سائنس کی خود اپنے ہی توہمات سے آزادی۔ وہ سائنس کے اور سائنسی طریقۂ کار کے معترف ہیں، لیکن ان کے بقول سائنٹزم (scientism) غلط ہے، جس نے سائنسی نظریات کو عقیدوں کی جگہ دے دی ہے اور یوں مذہب کے مقابلے میں ایک اور dogma تخلیق کر دیا ہے۔ وہ اپنے خطبات میں مثال کے طور پر ایسے دس خیالات کا، جنھیں وہ گمان قرار دیتے ہیں، بہت پرلطف پیرایے میں ذکر کرتے ہیں جنھیں سائنس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دانوں نے مضبوط بنیادوں کے بغیر ایمان کا درجہ دے رکھا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں کی دل چسپی کے لیے ہم یہاں ان دس ''سائنسی عقیدوں'' کی فہرست دے دیتے ہیں:

۱۔ ہر چیز لازمی طور پر میکانیکی (mechanical) ہے۔

۲۔ تمام مادہ شعور سے عاری ہے، یہاں تک کہ انسانی شعور بھی مادی دماغ کی کارروائیوں کا پیدا کیا ہوا ایک واہمہ ہے۔

۳۔ مادے اور توانائی کی مجموعی مقدار ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے (سوائے اس موقعے کے کہ جب تخلیق کائنات کے بگ بینگ (big bang) کے وقت تمام مادہ اور توانائی اچانک عدم سے وجود میں آ گئے تھے)۔

۴۔ فطرت کے قوانین ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے متعین اور غیر متغیر ہیں۔

۵۔ فطرت کا کوئی مقصد نہیں ہے اور نہ ارتقا کی کوئی سمت ہے۔

۶۔ حیاتیاتی موروثیت DNA اور اس طرح کے دوسرے مادوں کے ذریعے تکمیل پانے والا ایک خالص کیمیائی اور مادی عمل ہے۔

۷۔ ذہن سر کے اندر موجود دماغ کی کارکردگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

۸۔ یادیں کیمیائی مادوں کے طور پر دماغ میں جمع ہوتی ہیں اور موت پر فنا ہو جاتی ہیں۔

۹۔ جو باتیں سمجھی نہیں جا سکتیں، وہ واہموں کے سوا کچھ نہیں۔

۱۰۔ میکانکی طب ہی علاج کا واحد کارآمد انداز ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سمجھ کا ارتقا

سائنس کسی بھی حقیقت کو سمجھے بغیر تسلیم نہیں کرتی، یہ سمجھ چاہے مشاہدے پر اساس کرتی ہو، تجربے کا حاصل ہو یا منطق اور دلائل کا نتیجہ ہو، لیکن یہاں ایک دل چسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ سائنس سمجھ میں نہ آنے والی ہر بات کو رد کر دے؟ آج سے کچھ عرصہ پہلے کے سائنسی نظریات اس وقت کی سمجھ کے مطابق تھے۔ ان نظریات سے متصادم کوئی بھی خیال فقط مسترد کر دینے کے قابل تھا۔ پھر فہم و ادراک نے ترقی کی۔ مشاہدے اور تجربے کے ذرائع بہتر ہو گئے اور نظریات تبدیل ہو گئے۔ کیا ہم آج کے نظریے کو حرف آخر سمجھ لیں گے اور اس کے خلاف کسی اور خیال کو صرف اس لیے رد کر دیں گے کہ موجود ذرائع سے وہ آج ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟ مثال کے طور پر چند دہائیاں قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات میں مکمل خلا نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور سارا جہان ایتھر نامی ایک مادے سے پر

ہے۔کل کا یہ سائنسی نظریہ آج کی خام خیالی ہے۔اور کون جانتا ہے کہ آنے والے وقت کے لیے دوبارہ یہ ایک مان لی جانے والی حقیقت ہو۔اگر آج کے دور کی ایک عام سی ایجاد یا معلوم دریافت کا تذکرہ وقت کی حدود کے پار، آج سے پانچ دس ہزار سال پہلے کے معاشرے میں کیا جائے تو کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی سب سے زیادہ مخالفت کون کرے گا، یہ اس دور کے جہلا یا عام پڑھے لکھے لوگ نہیں، بلکہ علما اور سائنس دان ہوں گے، اور یہ مخالفت اس وقت کے معلوم سائنسی علم اور مروجہ اصولوں کی بنا پر ہوگی۔تو پھر کیا عجب ہے کہ جس طرح آج ہمیں یہ قدیم نظریہ انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ زمین کسی گائے کے سینگ پہ رکھی ہوئی ہے، اسی طرح کسی زمانے میں لوگوں کو یہ خیال بھی دور از کار لگے کہ ہماری زمین، اس کے ساتھی سیارے اور چاند، سورج کے قریب سے گزرنے والے کسی بڑے ستارے کی کشش کی وجہ سے سورج سے ایک لہر کے اٹھنے اور علیحدہ ہو جانے کا نتیجہ ہیں یا پھر کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کی تسلیم شدہ تھیوری ہی دیوانے کا خواب قرار دے دی جائے۔یوں خالص منطقی انداز میں دیکھا جائے تو تخلیق کائنات کے سبھی مروجہ نظریات کو دیوانے کا خواب قرار نہ دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے، کیونکہ اول تو یہ مادے یا توانائی کی کسی بھی شکل کو عدم سے وجود میں لانے کی کوئی وجہ یا میکانزم بیان نہیں کرتے، دوسرے اگر اس سب سے بڑے مسئلے کے سامنے اپنے علم و عقل کے گھٹنے عاجزی سے ٹیک کر، زنجیر کی اس سب سے پہلی کڑی سے صرف نظر بھی کر لیا جائے اور بات یہاں سے آغاز کی جائے کہ ایک دھواں یا نیبولا، بہرحال موجود تھا، تو اس دھوئیں کے اجزا (particles) کا باہم یکجا ہو کر ایک عظیم، بہت عظیم وجود بنا دینا تعجب انگیز ہے۔چلیے مان لیا کہ کشش ثقل (gravity) اس کا باعث بنی۔(ہم یہاں یہ بحث بھی نہیں کرتے کہ یہ کشش آخر تھی ہی کیوں؟) پھر یہ عظیم گولا ٹوٹ کر کہکشاؤں اور ستاروں میں تقسیم ہو جاتا ہے، یعنی آسان الفاظ میں یوں سمجھیے کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے، نظر نہ آ سکنے والے ذرات آپس میں ملتے ہیں اور پھر بہت بڑے بڑے ستاروں اور سیاروں کے گروہوں کی صورت میں جدا ہو جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

چند سوالات

یہاں ظاہر ہے کہ سوچنے والے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔اگر بہت باریک اور پیچیدہ الجھنوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی یہ بہرکیف پوچھا جا سکتا ہے کہ:

ا۔ وہ کون سی قوت تھی جو اس دھوئیں کو، دھوئیں کے ذرات کو عدم سے وجود میں لائی؟ (ہم یہاں عدم سے وجود میں آنے کے طریقۂ کار یا میکانزم کی بات نہیں کر رہے ہیں)۔

ب۔ان ذرات کو جوڑنے والی طاقت کو اگر gravity کا نام دے کر اس کے ماخذ، وجوب یا جواز سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو وہ کون سی طاقت تھی جس نے اس لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی گریویٹی کے خلاف زور لگا کر باہم جڑے ہوئے اور ہر لمحہ مزید قریب ہوتے ہوئے اجزا کو (کہ جیسے جیسے یہ گولا بڑھ رہا تھا، اس کی گریویٹی کا کھچاؤ بھی بڑھ رہا تھا) ستاروں اور سیاروں کی شکل میں توڑ کر علیحدہ کیا اور اس شدت سے ایک دوسرے سے دور کیا کہ وہ آج تک ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں؟

یہ نہیں کہ ہمارے ذہین فزسسٹ ان معموں سے آگاہ نہیں ہیں، لیکن جیسے ہمارے علماے دین اکثر چند ایسے سوالوں سے بچنے کے لیے، جنھیں خود انھی کے تراشیدہ اوہام نے پیچیدہ بنا دیا ہے، اپنی ہی وضع کردہ اصطلاحات کی آڑ لیتے ہیں، وہ بھی بالکل اسی طرح میدان تخلیق، طبعی وحدانیت، بگ بینگ، event horizon اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحات تراشتے ہیں اور ایسے تمام سوالات اور معموں کو ان اصطلاحات کے بلیک ہولز میں ڈال دیتے ہیں۔

ہمارا مقدمہ نہایت آسان ہے۔ آپ منطق اور فہم کی بے چارگی کی بنا پر یا یوں کہیے کہ اس وجہ سے خدا کے وجود سے انکاری ہیں کہ آپ تمام چیزوں اور کائنات کے سارے عوامل کو حس و ادراک اور عقل سے سمجھنا چاہتے ہیں، تو ٹھیک ہے پھر یک رخے ہو جائیں، ہمیں ان سارے سوالوں کے منطقی جواب دیں۔ اپنی اس کہانی میں ہر موڑ، ہر راستے اور ہر تاریک راہ داری کی وضاحت منطق اور دلیل کے جانے مانے اصولوں سے کیجیے۔ ہمیں سمجھا دیں۔ یہ مت کیجیے کہ جو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اسے کسی قانون اور قاعدے کا نام دے دیں اور جو قانون اور قاعدے سے بھی تجاوز کر جائے، اس کے ماتھے پر خوب صورتی سے گھڑی ہوئی کسی اصطلاح کا جھومر سجا دیں۔ اور ہمارے اور اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کے جواب میں کسی قانون یا کسی اصطلاح کا حوالہ پیش کر دیں۔ آپ خالق کی ذات کو تسلیم کیے بغیر تخلیق و وجود کے اور ''کیوں'' کے تمام معمے حل کر سکتے ہیں تو بسم اللہ کیجیے۔

دوسری صورت میں اگر آپ نے اس ادھوری منطق اا ور کچھ سمجھ میں آنے والے اور کچھ سمجھ میں نہ آنے والے، بلکہ ہمارے مطابق حقیقتاً کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے والے نظریات، کیونکہ آپ کے پاس کسی ایک بھی امر یا عمل کا، کسی بھی قاعدے یا قانون یا اصول کا کیوں، بہر حال جواب کے بغیر رہ جاتا ہے، کے ساتھ گزارا کرنا ہے تو کیوں نہ ان حس و ادراک سے بالاتر طاقتوں کو ماننے کے بجائے حس و ادراک سے ماورا طاقت ور کو، اور فہم و شعور سے بالاتر اصولوں اور قوانین سے پہلے ان کے خالق کی فہم و شعور سے بالاتر ذات کو مان لیا جائے۔ اس طرح کم از کم تہ در تہ اسرار کے اندھیرے سے ڈھکے ہوئے اس پیچ در پیچ زینے کے ایک سرے پر تو روشنی ہو جائے گی، 'کیسے' کے رموز

جاننے کی جدوجہد جاری رہے گی، لیکن جگہ جگہ 'کیوں' کے طاقچوں میں رکھے چراغ تو جل اٹھیں گے۔ رہا خالق کی ہستی کو سمجھنے کا مسئلہ تو جب خالق کو مان لیں تو اس معاملے میں اسی کے فرمان کو رہنما بنانا پڑے گا: ''(شعور اور ادراک کی) آنکھیں اسے پا نہیں سکتی*۔''

کسی کھنڈر کو دیکھ کر دیکھنے والوں کے دلوں میں ضرور یہ خیال آ سکتا ہے کہ یہ حوادث زمانہ کا نتیجہ ہے۔ کسی شان دار عمارت کو وقت نے رفتہ رفتہ برباد کر دیا ہے، لیکن انتہائی کمال کے ساتھ بنی ہوئی کسی عمارت کو دیکھ کر یہ خیال آنا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ آہستہ آہستہ خود ہی بنتی چلی گئی ہے، ایک انتہائی عجیب امر ہوگا۔ اور اگر کوئی صاحب ایسا سوچتے ہیں کہ یہ کائنات خوب صورت، پیچیدہ اور منظّم نہیں ہے، کسی ترتیب یا کسی منصوبے کی آئینہ دار نہیں ہے، تو ان سے میری گزارش ہے کہ وہ کائنات کو دوبارہ دیکھیں، جتنا کچھ بھی دیکھ سکیں۔

توحید

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اگر ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود نہیں بنی ہے، بلکہ کوئی اسے ایک منصوبے کے مطابق عدم سے وجود میں لایا ہے، تو سمجھیے کہ الوہیت کے معاملے میں ہمارا اتفاق رائے قائم ہو گیا ہے۔ اگلا مرحلہ توحید کا ہے، یعنی کیا ہماری اور ہماری کائنات کی خالق، مالک اور منتظم ایک ہی ہستی ہے یا ایک سے زیادہ؟ فرض کیجیے، ہم یہ مان لیتے ہیں کہ دنیا کی تخلیق اور اس کے انتظام کی ذمہ داری ایک سے زیادہ ہستیوں پر ہے تو ہمیں چند دل چسپ سوالات کا سامنا کرنا ہوگا:

۱۔ کیا مخلوق کی ہر نوع کا ایک الگ خالق ہے؟

۲۔ کیا ہر نوع کی مخلوق کے ہر جزو کا ایک الگ خالق ہے؟

۳۔ کیا ان خالق ہستیوں کے مابین تعلق اور ربط کا سلسلہ موجود ہے؟

۴۔ کیا اس ربط و تعلق اور پھر اس کے نتیجے میں دنیا میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے یہ خالق اور ناظم ہستیاں کسی بالاتر قانون اور قاعدے کی پابند ہیں؟

۵۔ اگر ایسا ہے تو کیا یہ غیر متغیر پابندی یقینی بنانے کے لیے ان ہستیوں سے بالاتر کوئی اور ہستی بھی موجود ہے؟

۶۔ مخلوق کی جو نوع مٹ (extinct) جاتی ہے، مثلاً ڈائنوسار، کیا اس کی خالق ہستی بھی ناپید ہو جاتی ہے؟

۷۔ مخلوق کے وہ معاملات جو آپس میں تعلق کے محتاج ہیں، اور ہمارا یہ خیال ہے کہ تقریباً تمام ہی معاملات ایسے ہیں جن سے کوئی بھی مخلوق، نہ تو مجموعی لحاظ سے اور نہ ہی انفرادی اعتبار سے، دوسروں سے الگ اور بے نیاز ہو کر،

* الانعام ۶: ۱۰۳۔

عدم انحصار کے ساتھ نمٹ سکتی ہے، ان کے سلسلے میں ان مخلوقات کے خداؤں کی ذمہ داریوں کا تعین کیسے ہوتا ہے؟

ان سوالوں میں سے مزید سوال نکلتے چلے آئیں گے اور کچھ ہی دیر میں سوچنے والے ایک ذہن کو یہ احساس ہوگا کہ اگر ہم خداؤں کے تعدد کا تصور مان لیں تو اپنی اس بحث کے آغاز میں ہم جن سوالوں سے مخلوق کے سلسلے میں دوچار تھے، بعینہٖ انھی، بلکہ ان سے بھی پیچیدہ سوالات ہمیں خالقوں کے بارے میں درپیش ہوں گے، یعنی مسئلہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ جائے گا۔

ربط و تعلق

دنیا کے نظام پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ہمیں کہیں بھی عدم تسلسل یا ربط و تعلق کی کمی کا احساس نہیں ہوگا۔ ایٹم سے لے کر ستاروں اور سیاروں تک ہر شے ایک ضابطے کی پابند اور ایک جواز کی مظہر ہے۔ الیکٹرانز کی اپنے مداروں میں گردش مالیکیولز کو وہ چارج فراہم کرتی ہے جو ان کے آپس کے بانڈز کا سبب ہے۔ اس گردش کی رفتار، راستے یا تسلسل میں ذرا سی تبدیلی مادے کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے کافی ہے۔ سورج کی روشنی اس زمین کے اوپر موجود ہر طرح کی زندگی کا براہ راست یا بالواسطہ موجب ہے۔ سورج اور زمین کا آپس میں فاصلہ اس زندگی کو قائم رکھنے کے لیے انتہائی نپا تلا اور موزوں نظر آتا ہے۔ انھی انتہائی موزوں اور نپے تلے فاصلوں پر ہمارا نظام شمسی، اور اس سے بھی بڑھ کر ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کی یہ ساری کائنات قائم ہے۔ اگر زمین کی مثال لے لی جائے تو اس درمیانی فاصلے میں بہت معمولی سی کمی اس سیارے پر پائی جانے والی ہر طرح کی حیات کو جلا دینے کے علاوہ اسے بالآخر سورج کی طرف کھینچ لیے جانے کا باعث ہو سکتی ہے، جبکہ اس فاصلے میں تھوڑی سی زیادتی نہ صرف تمام مخلوق کو منجمد کر دے گی، بلکہ زمین کو نظام شمسی سے باہر بھی پھینک سکتی ہے۔ اس کے علاوہ زمین کے گرد اوزون کی تہ ہمیں نقصان دہ تابکاری اور میٹیو رائیٹس (meteorites) کی چاند ماری سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔

پھر زمین کی سطح پر آ جائیں تو گلیشئرز کے جمنے اور پگھلنے سے لے کر دریاؤں اور سمندروں کے بہاؤ، چشموں کی روانی، بادلوں کے برسنے اور زمین کی زرخیزی تک ایک ربط اور تسلسل کی داستان ہے۔ ایکو سسٹم کی زنجیر دیکھ لیجیے، جس کی ہر ایک کڑی پورے نظام کی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ یوں تو یہ ہر علاقے کا ایک مکمل نظام ہے، لیکن جس طرح ایک ایکو سسٹم کے سب کردار، جان دار اور بے جان عوامل ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، کم و بیش اسی طرح مختلف نظام بھی باہمی ربط و تعلق اور ہم انحصاریت کے ساتھ اس سیارے اور اس پر پائی جانے والی زندگی کی بقا کے لیے روبہ عمل ہیں۔ ناپید ہو جانے والی نسلوں اور مخلوقات کا خوراک کے توازن اور معدنی ذخائر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نائیٹروجن سائیکل: ایک مثال

اس دنیا میں ہر لمحہ وقوع پذیر ہونے والے قدرتی عوامل خواہ بظاہر وہ کتنے ہی معمولی یا کیسے ہی عظیم الشان کیوں نہ ہوں، سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے اس آپس کے رشتے پر تفصیلی بحث ہمارے اس مختصر سے مضمون کے دامن سے متجاوز ہے، لیکن ہم اپنے نکتے کو راسخ کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی مثال بیان کرتے ہیں اور پھر آگے چلتے ہیں۔ سورج کی روشنی، زندگی کے لیے اس کا بنیادی کردار اور غذائی زنجیر کا سرسری سا تذکرہ تو ہم کر ہی چکے ہیں، لیکن شاید بہت زیادہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ نائیٹروجن بھی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے، کیونکہ یہ پروٹین، جینیاتی مادے اور توانائی کے پیکٹس (ATP) سب کا لازمی جزو ہے۔ ہماری فضا میں ۷۸ فیصد نائیٹروجن ہے، لیکن اپنی اس حالت میں یہ اگرچہ سانس کے ساتھ ہمارے جسم میں آتی جاتی رہتی ہے، لیکن استعمال نہیں ہو سکتی۔ قابل استعمال ہونے کے لیے اسے اپنی مالیکیولر حالت سے ٹوٹ کر آکسیجن یا ہائیڈروجن کے ساتھ ملنا پڑتا ہے۔ یہ عمل فضا میں سب سے زیادہ آسمانی بجلی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ پھر بارش اس قابل استعمال نائیٹروجن کو زمین کے حوالے کر دیتی ہے۔ یہاں اس پر وہ جراثیم عمل کرتے ہیں جو یا تو زمین میں آزاد حالت میں یا پھر مختلف پودوں کی جڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بیکٹیریا ایک خاص اینزائیم (enzyme) کے حامل ہوتے ہیں جو اس نائیٹروجن کو امونیم آئینز میں تبدیل کرتا ہے۔ پودے اس کو پروٹین میں بدلتے ہیں اور جانور ان پودوں کو کھا کر اس پروٹین کو اپنا جزو بدن بناتے ہیں۔ پھر جب جانور مر جاتے ہیں تو کچھ ایسے بھی بیکٹیریا ہیں جو ان جسموں کی تحلیل اور decomposition کرتے ہیں اور اس دوران نائیٹریٹ آئینز کو اپنی مطلوبہ توانائی حاصل کرنے کے لیے دوبارہ نائیٹروجن گیس میں بدل دیتے ہیں جو کہ واپس فضا میں پہنچ جاتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سرسری سا تذکرہ ہمارے پڑھنے والوں کو اس کائنات میں قائم اور مسلسل روبہ عمل harmony اور باہم انحصاریت (interdependence) کا احساس دلانے کے لیے کافی ہو گا۔

اگر ہم ایک سے زیادہ خالق ہستیوں کے تصور کے قائل ہیں تو ہمیں ان کے درمیان ایک انتہائی مضبوط اور کبھی خطا نہ کرنے والے ربط پر بھی ایمان لانا ہو گا۔ اور اس ربط اور نظم و ضبط کا کھوج لگاتے لگاتے اور تخلیق کی ابتدا کے زینے چڑھتے چڑھتے بالآخر ہماری سوچ کسی ایک خالق، ایک coordinator کے خیال کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی ہو گا۔ یوں بھی جب ہمیں یہ ماننا ہی ہے کہ یہ دنیا خود بخود نہیں بن گئی ہے، بلکہ اسے بنایا گیا ہے تو پھر ہم اس مضمون کے پہلے مرحلے کی تمام الجھنیں اٹھا کر دوسرے مرحلے میں کیوں لے جائیں اور کیوں نہ چیزوں کو سادہ رکھیں۔ خالق کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مان ہی لیا ہے تو اسے ایک ہی کیوں نہ مانیں کہ integration اور coordination کے تمام معاملات طے پا جائیں اور تخلیق کا سوال سلجھنے کے بجائے مزید پیچیدہ نہ ہونے پائے۔

رسالت

اس مضمون کے تیسرے مرحلے میں ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ کیا کائنات کے خالق نے اپنی اس ذی شعور مخلوق کے لیے کوئی پیغام ہدایت بھی بھیجا ہے۔ اس کے لیے پہلے ہمیں انسان کی حیثیت کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔

انسان کی حیثیت

خدا کا تصور رکھنے والے مذاہب اور عقیدے خدا کی حیثیت کے بارے میں مختلف طرز فکر کے حامل ہو سکتے ہیں، لیکن ایک خیال سب میں مشترک ہے اور وہ ہے: روز آخرت کا خیال، یعنی انسان سے ایک دن اس کے اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ ضرور ہوگی۔ اس خیال کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کوئی معمولی اور غیر اہم چیز نہیں ہے۔ اس کائنات کا حصہ ہونے اور اس کا نظام چلانے میں اپنا کردار نبھانے کے حوالے سے دنیا کا کوئی ایک ذرہ بھی غیر اہم نہیں ہے، لیکن انسان پر اپنے شعور کے باعث، اور اس کی مناسبت سے کچھ اضافی ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے شعوری اعمال کے علاوہ کسی نہ کسی حد تک اپنے جبلی افعال میں بھی انتخاب کا حق رکھتا ہے۔ اس کے ارادے اور اس کے عمل سے اور اس کی کوشش سے اس نسل کی اجتماعی زندگی میں دیرپا تبدیلیاں آسکتی ہیں اور آتی ہیں۔ دنیا کی کسی اور ذی روح مخلوق نے اپنے دائرۂ معمول سے نکل کر اپنے ماحول اور اس سے فزوں کو کھوجنے، دریافت کرنے اور اپنے کام میں لانے کی ایسی کوشش نہیں کی ہے یا اگر ایسی کوئی کوشش کی بھی ہے تو اس کا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق دوسری جان دار اور بے جان اشیا کے اوپر اتنا اثر و تصرف حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔ حضرت انسان ہی کے حرکت و عمل کے نتیجے میں دنیا کا قدرتی ماحول تبدیل ہوتا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس گفتگو سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اپنے قاری کو مذہبی پہلو میں الجھائے بغیر ایک مخلوق اور کائنات کا ایک ذی شعور حصہ ہونے کے لحاظ سے انسان کی باقی تمام مخلوقات پر فوقیت اور اہمیت اجاگر کر سکیں۔ یہاں اچھے اور برے کی بات نہیں ہے۔ ہمارا نکتہ یہ ہے کہ انسان کے افعال اور اس کا کردار اس کائنات میں اہم ہے، significant ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کچھ ایسا مشکل سے سمجھ میں آنے والا عقدہ نہیں ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے باقی جان داروں کے مقابلے میں انسان کی خصوصیات کا مزید ذکر کریں اور سائنس و فلسفے، صنعت و حرفت، ایجاد و دریافت، جنگ و قتال، طب و جراحی، سیر و سفر، کھیل، تفریح یا فن و ادب کے میدانوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے اس کے لیے مثالیں دیں۔ یہاں ہم اس مضمون کے پہلے دو حصوں کے نتائج کو اپنے مذکورہ بالا خیال کے ساتھ منطبق کریں گے۔ ابھی تک کے سفر میں ہم نے اتفاق کیا کہ کائنات خود بخود نہیں بنی ہے، بلکہ اسے ایک سوچے سمجھے ارادے کے تحت بنایا گیا ہے، اور یہ کہ اس کو بنانے چلانے والی ایک ہی ہستی ہے۔ مضمون کے تیسرے حصے میں ابھی تک ہمارا اتفاق راے اس بات پر ہوا کہ انسان کا کردار اس کائنات کے ایک حصے کے طور پر انتہائی اہم ہے۔ ان تینوں نکات پر اتفاق کر لینے کے بعد یہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں، بلکہ عین منطقی ہے کہ خالق ہستی کی طرف سے اپنی اس ذی شعور مخلوق کے لیے، جسے اس نے ارادے کی آزادی بھی دے رکھی ہو، ہدایت و رہنمائی کا انتظام ہونا چاہیے۔

خالق کا نائب

ہدایت و رہنمائی کی ضرورت اور اہمیت سمجھ لینے کے بعد ہم اس کے طریقۂ کار پر بات کر لیتے ہیں۔ اگر ہم انسان کو فقط ایک مخلوق ہی تصور کریں تو ایک تواتر کے ساتھ آنے والی ہدایات کے بجاے اس کی جبلت میں موجود، اس کی تخلیق کے ساتھ ہی تخلیق کردہ، by default ہدایات کافی سمجھی جانی چاہییں، لیکن جب ہم اسے باقی کی تمام مخلوق سے ممتاز گردانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ انسان اپنے ارادے، شعور اور صلاحیت کی بنا پر اس کائنات کو تسخیر کرنے، اپنے تصرف میں لانے اور اس میں تبدیلی لانے پر کسی حد تک قدرت رکھتا ہے تو ہم اسے ایک مخلوق کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹے سے خدا کی حیثیت بھی دیتے ہیں، یعنی اگر ہم مذہبی اصطلاح مستعار لیں تو آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسان اس زمین پر بڑے اور اکیلے خدا کے نائب یا viceroy کے منصب کا بھی حامل ہے۔ چنانچہ اپنے نائب کے لیے اس کی جبلی اور in-built ہدایات کے علاوہ کائنات میں تصرف اور نفوذ کے حوالے سے، اور اپنی ذات اور برادری کے معاملات میں اپنے رویے اور عمل میں انتخاب کے اعتبار سے خصوصی رہنمائی ضروری قرار پاتی ہے۔

ہم اس جملے کو زیادہ قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک جان دار ہونے کے لحاظ سے خوراک حاصل کرنا، نسل بڑھانا، خطرے سے بچنا اور پناہ گاہ کی تلاش، انفرادی طور پر، اور ایک پیچیدہ اور منظّم مخلوق ہونے کی وجہ سے اکٹھے ہونے کا احساس، اور نظم وضبط کا کچھ نہ کچھ بنیادی تصور مجموعی حیثیت سے انسان کے اندر جبلی اور by default طور پر موجود ہے، لیکن اپنی زندگی اور بقا کی یہ فکر باقی جانوروں سے الگ، انسان میں بالکل عریاں نہیں ہے۔ یہاں ان جبلتوں نے ذائقوں، انسیت، تعلقات، خواہشوں، آرزوؤں اور احساسات کے مختلف لبادے اوڑھ رکھے ہیں۔ یہی لبادے جہاں ایک طرف حضرت انسان کو تہذیب بخشتے ہیں اور علم وفن، تعمیر وترقی، اصول وقوانین اور تخلیقیت کی جانے کن کن دنیاؤں سے روشناس کراتے ہیں تو دوسری طرف ظلم وفساد، جنگ و جبر اور تباہی و بربادی کے بھی بازار

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

گرم کرتے ہیں۔ چنانچہ لازم ٹھیرا کہ جب کسی کو بنانے اور سنوارنے کی صلاحیت دی گئی ہے تو اس صلاحیت سے کام لینے کے لیے بنیادی ہدایات بھی فراہم کی جائیں۔ رہا یہ سوال کہ خالق نے اگر اپنی ایک مخلوق کو ارادے کے ساتھ ساتھ شعور دے دیا ہے تو پھر بار بار کی ہدایات کی کیا ضرورت ہے؟ وہ مخلوق اسی شعور کی بنا پر اپنے اچھے برے کا فیصلہ کر سکتی ہے، تجربات سے سیکھ سکتی ہے اور قدم بہ قدم ایک اجتماعی ترقی اور خوش حالی کی منزل کی طرف بڑھ سکتی ہے، تو یہ سوال خاصا متعلق ہے۔ درحقیقت، بات کچھ ایسی ہی ہے۔ خالق نے جب اپنی ایک لڑتی بھڑتی، خون خرابا کرتی مخلوق کو، جو شاید اس وقت کہیں غاروں میں رہتی تھی اور لباس کے تصور سے ناآشنا تھی، زمین پر اپنی نیابت دینے کا فیصلہ کیا تو اس کے جینیٹک میک اپ (genetic make-up) میں تبدیلی کی وہ پہلی کڑی راہ پا گئی جس نے اسے دو پیروں پر کھڑا کیا اور دوسرے تمام چوپایوں سے ممتاز کر کے homosapien بنا دیا۔ یہی ارتقائی عمل (evolution process) میں شعور کے باب کا آغاز تھا۔ جنت میں اس منظر کی کیا simulation تھی، وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، کیونکہ وہ غیب کی دنیا سے متعلق ہے اور اس کے لیے ہم صرف انھی معلومات پر اکتفا اور یقین کرتے ہیں جو آسمانی کتابوں نے بہم پہنچائی ہیں، لیکن ظہور کے پردے پر واقعات بظاہر ایسے ہی وقوع پاتے معلوم ہوتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بنیادی شعور: زادراہ

انسان کو جب نیابت کی ذمہ داری کے لیے منتخب کیا گیا تو اسے ضروری معلومات اور شعور فراہم کر دیا گیا جو اس مقام کا تقاضا تھا۔ اور یہی وہ ابتداءً دیا گیا علم اور احساس ہے جو انسان کو اخلاقی، سماجی، اور علمی اعتبار سے ارتقا کی اس منزل کی طرف لیے جاتا ہے جہاں انصاف ہو، خوش حالی ہو، صحت اور خوشی ہو، جہاں اکٹھے رہنا برداشت کا مظاہرہ نہیں، بلکہ لطف کا باعث ہو، جہاں صفائی، پاکیزگی اور امن ہو، جہاں محبت ہو اور عافیت ہو، یعنی وہ منزل جو جنت ہے۔ انسانی حقوق کے چارٹر، امن کے بین الاقوامی معاہدے، جنگ اور خوں ریزی کے خلاف قانون سازی، ماحولیاتی تحفظ کی کوششیں، تعلیم کی اہمیت کا احساس، اور سائنسی تحقیقات، دریافت کی دنیا کے نئے افق، ایجادو آلات کی کرشمہ سازیاں، یہ سب اسی شعور کی مثالیں ہیں، لیکن چونکہ انسان کو ساتھ ہی ساتھ ارادے اور اس پر عمل کی کوشش میں آزادی بھی حاصل ہے، لہٰذا انھی سب مثالوں کے مضمرات بھی ہم سے مخفی نہیں ہیں، گویا اس ابدی شعور اور احساس کے ساتھ ارتقا کا یہ سفر کئی بار ارادے اور اختیار کے ہاتھوں گمراہی کا شکار بھی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ارادہ اور اختیار کچھ ایسی برائیاں ہیں کہ جو اپنے حامل کو ہمیشہ بے راہ ہی کریں گی اور نقصان پہنچائیں گی۔ اسی نیت اور انتخاب کی بدولت عزم و کوشش کے ہتھیاروں سے انسان نے وہ کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں جو بظاہر ناممکن دکھائی دیتی ہیں،

لیکن چونکہ دونوں طرح کے امکانات برابر ہیں، لہٰذا اس ابدی شعور کی روشنی کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہدایات اور ہدایت کا نقشہ بھی فراہم کیا جاتا رہا۔

اضافی راہنمائی: سفر کا نقشہ

اسی بات کو میرے اس کمپیوٹر دور کے قارئین ایک اور مثال سے زیادہ اچھی طرح سمجھ پائیں گے۔ آپ گھر سے ایک سفر پر نکلے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی منزل کیا ہے۔ آپ کی گاڑی چلنے کے لیے ٹھیک حالت میں ہے۔ اس میں ایندھن بھی کافی ہے اور اس کی لائٹس اور گیجز بھی درست کام کر رہی ہیں۔ پھر آپ اس کا GPRS بھی آن کر لیتے ہیں، اور اس پر منزل کی نشان دہی کر کے اسے activate کر لیتے ہیں۔ آپ کی ڈیوائس کی اسکرین پر آپ کے شہر کا نقشہ، آپ کی اپنی location، اور منزل تک کے مناسب ترین راستے کی نشان دہی ہوتی ہے اور آپ بڑی سہولت اور اعتماد سے اس اسکرین پر اپنی گاڑی کے نشان کی حرکت کے مطابق اپنے سفر کی درستگی کا اندازہ کرتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں، لیکن راستے میں جہاں کہیں آپ غلطی سے یا جان بوجھ کر، کسی رکاوٹ کی وجہ سے یا صرف ایک نیا راستہ دیکھنے کی خاطر غلط موڑ مڑتے ہیں تو GPRS اسکرین پر آپ کو نئی ہدایات دینے لگتا ہے۔ وہ چاہے کچھ دیر کا کوئی متبادل راستہ ہو یا پورے کے پورے روٹ کی تبدیلی ہو۔

بالکل اسی طرح انسان کو جب نیابت کے منصب پر فائز کیا گیا تو اسے زندگی کے اس سفر کے لیے بنیادی ہدایات دے دی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے وعدہ بھی لے لیا گیا کہ جب ضرورت کے وقتوں میں خالق کی طرف سے مزید ہدایات اس تک پہنچیں گی تو وہ ان پر عمل کرے گا۔ پھر اسے ارادے اور اختیار کے ہتھیاروں سے لیس کر کے، شعور کی روشنی میں اس سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ بنی نوع انسان کے اس تاریخی سفر میں جہاں کہیں اس کی غلطی کی وجہ سے، اس کے ارادے اور عمل کے غلط استعمال کی پاداش میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر، بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں حالات میں تبدیلی آنے کی وجہ سے اس کی راہ کھوٹی ہوئی ہے، الوہی رہنمائی اس کی مدد کو پہنچتی رہی ہے۔

چنانچہ دیکھ لیجیے انسان نے جہاں کہیں بھی خود، کسی بھی سطح پر کوئی نظریہ، ازم یا مذہب دیا ہے یا آسمانی ادیان میں اپنی عقل سے تبدیلی کی ہے، خامیاں رہ گئی ہیں۔ مثال کے طور پر دور حاضر کے سب سے بڑے clichet، انسانی حقوق ہی کو لے لیجیے، ایک شخص کے حقوق کا دوسرے شخص کے حقوق کے ساتھ تصادم اور فرد اور معاشرے کے حقوق میں ٹکراؤ کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو جاننے کے لیے زیادہ غور وخوض کی ضرورت ہو۔ کیا آپ اس کرۂ ارض پر کسی جگہ کو صحیح معنوں میں smokin zone قرار دے سکتے ہیں؟ اظہار رائے کی آزادی کے حق کے ساتھ دوسروں کی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دل آزاری کی حد بندی ایک تو انتہائی subjective اور judgmental معاملہ ہے، دوسرے ذرا سوچ کر بتائیں کہ ایسی کتنی آرا ہیں جن کے اظہار سے کسی نہ کسی کی دل آزاری نہ ہوتی ہو۔ ہم نے یہ دو مثالیں اختصار کی خاطر اٹھائی ہیں، ورنہ آپ ذرا سا غور کریں تو ایسے بے شمار سقم مل جائیں گے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ انسانی حقوق تک کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اسے مکمل طور پر انسانی ہاتھوں میں نہیں دیا جا سکتا۔

آخرت

تاریخ کے مختلف ادوار میں انسان کی رہنمائی کے لیے آنے والے اس الوہی پیغام کے بنیادی نکات میں توحید اور عبادات کے علاوہ فرد اور معاشرے سے تعلق رکھنے والے معاملات اور روز حساب کا تصور شامل ہے۔ ان چار باتوں کی ہمہ گیر اہمیت اور ارتقا کے اس سفر میں ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہی چار باتیں انسانی اصلاح اور فلاح کے نسخے کے اجزاے ترکیبی ہیں۔ توحید ہمیں وہم و گمان سے، خوف اور جبر سے آزاد کرتی ہے کہ وہی ایک ہستی ہماری خالق اور مالک ہے اور اس کے علاوہ کسی کی بھی ہیبت یا قوت ہمیں کسی طرح کا فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ عبادات ہمیں ایک نظم میں کستی ہیں اور ہماری اخلاقی نشوونما کے علاوہ ایمان میں اضافہ کرتی ہیں۔ معاملات کی درستگی ہمارے خاندان اور معاشروں کو بہتر بناتی ہے اور روز جزا کا خیال ہمیں اپنے اعمال کے لیے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہراتا ہے۔

اس پیغام کا انکار کرنے والوں کو ہمیشہ اسی آخری جزو پر اعتراض رہا ہے۔ خدا کو کسی نہ کسی صورت میں لوگ ہمیشہ سے مانتے ہی رہے ہیں۔ مختلف قوموں کے مشرکین بھی بہر طور ایک خدا کی برتری کو تسلیم کیا کرتے تھے۔ عبادات بھی کسی نہ کسی شکل میں رائج رہی ہیں۔ معاملات میں راستی اور انصاف کی اہمیت سے بھی کبھی کھل کر انکار کرنا ممکن نہیں ہوا، لیکن حیات بعد از موت کا معاملہ ایسا ہے کہ جس پر آسمانی ادیان کے مخالف ہمیشہ شک میں رہے، بلکہ اس تصور کا مذاق بھی اڑاتے رہے۔ آخری دین ـــــ اسلام ـــــ کے منکر بھی اس پر سب سے بڑا اعتراض یہی کرتے تھے کہ آخر جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے؟

حیات بعد از موت

اس سوال کا جواب اس دور میں آ گیا ہے۔ قرآن میں آتا ہے کہ ''ہم انھیں آفاق میں اور خود ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ سچ ان پر واضح ہو جائے گا۔*'' چنانچہ اب تو کلوننگ بھی ایک پرانی خبر ہے، لیکن اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مردہ میں سے زندہ کھڑا کر دینے کے لیے تو بس ایک خلیے ہی کی ضرورت ہے، اور یہ

* حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۵۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ضرورت بھی انسان کے ابھی تک کے اخذ کیے ہوئے طریقے کے مطابق ہے۔ عین ممکن ہے کہ کچھ اور سال ادھر کلوننگ کا طریقۂ کار اور بھی سادہ ہو جائے۔ پھر یہ کمال تو مخلوق کو حاصل ہو گیا ہے، اگر خالق مردہ کو زندہ کرنا چاہے تو کائنات کا کون سا حصہ اس کی باقیات حاضر نہیں کر دے گا اور سیل کی تقسیم اور بڑھوتری کی وہ کون سی کڑی ہے جو اس مالک کل کے فرمان کی تعمیل میں جڑ نہیں جائے گی۔

جواب دہی

یوں بھی ہم اگر اس کائنات کو کسی حادثے کا نتیجہ نہیں سمجھتے اور اس بات پر متفق ہو چکے ہیں کہ کسی مقتدر ہستی نے ایک منصوبے کے مطابق اپنے ارادے سے اسے پیدا کیا ہے تو یہ سوچنا بالکل بعید از عقل ہوگا کہ وہ اس زندگی میں ہونے والے تمام معاملات کو کسی جواب دہی کے بغیر اور ان ساری ادھوری کہانیوں کو کسی انجام کے بغیر چھوڑ دے گا، دنیا جن سے بھری پڑی ہے۔ انسان کو اگر ارادے کی آزادی، انتخاب کا اختیار اور عمل کی صلاحیت دی گئی ہے تو ضرور ہے کہ اس سے پوچھ گچھ بھی ہو۔ اور اگر پوچھ گچھ ہونا لازمی ٹھہرا ہے تو پھر یہ عین انصاف ہے کہ ایسی ہدایات ضرور دی گئی ہوں کہ جن پر عمل کرنے نہ کرنے کے بارے میں یہ پوچھ گچھ ہو۔ ان ہدایات سے ارادے اور عمل کی آزادی پر کوئی حرف اس لیے نہیں آتا کہ ان ہدایات کو ماننا نہ ماننا مکمل طور پر آزاد ارادے کے تابع ہے۔ انسان اگر اپنی مرضی اور اختیار سے ان ہدایات کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو انعام کا مستحق ہے اور اگر اس مرضی اور اختیار کو ان ہدایات کے رد کرنے میں استعمال کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے اس کا نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں ہم پھر ایک مثال کا سہارا لیں گے کہ جب کوئی اچھی کمپنی کوئی چیز، جیسے کہ ٹیلی فون سیٹ بناتی ہے تو سب سے پہلے اس کا خیال تخلیق ہوتا ہے۔ یعنی وہ پراڈکٹ conceive ہوتی ہے۔ پھر وہ اس خیال کے مطابق درست طریقے سے بنائی جاتی ہے، ایجاد ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کے لیے اندازہ مقرر ہوتا ہے کہ وہ کیا کچھ کرے گی اور کتنا عرصہ چل پائے گی۔ آخر میں اس کے درست استعمال سے متعلق ہدایات تیار ہوتی ہیں جن کا کتابچہ خریدار کو اس سیٹ کے ساتھ دیا جاتا ہے، (اور جو بہت کم لوگ پڑھتے ہیں) اس ہدایت نامے پر اس سیٹ سے متعلق تمام معلومات اور رہنمائی درج ہوتی ہے۔ اسی میں ساری احتیاطیں بھی لکھی ہوتی ہیں۔ اس پراڈکٹ کا بہترین استعمال اور لمبی زندگی کا امکان، ان ہدایات پر عمل کرنے اور ان احتیاطوں کو بروے کار لانے کی صورت میں بڑھ جاتا ہے۔ یہی چار مراحل خالق اپنی پراڈکٹ کے بارے میں بھی بتاتا ہے:

''وہ جس نے پیدا کیا، پھر درست کر دیا، پھر اس کے لیے تقدیر کو (ایک اندازہ) مقرر کیا، پھر ہدایت دی۔''
(الاعلیٰ ۸۷: ۲-۳)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اسلام

اس مضمون کے اس مختصر سے سفر میں ابھی تک ہم جن منزلوں سے گزرے ہیں، وہ کچھ اس طرح سے ہیں: ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کائنات کو خلق کیا گیا ہے اور یہ کسی حادثے کی وجہ سے خود بخود نہیں بن گئی ہے۔ پھر ہم نے اس پر اتفاق کیا کہ اس دنیا کو بنانے اور چلانے والی ایک ہی ہستی ہے اور اس کام میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے یہ سمجھا کہ اس زمین پر بسنے والی مخلوقات میں سے انسان سب سے زیادہ باشعور اور ارادے اور عمل کے ساتھ ساتھ اختیار کی طاقتوں سے مالا مال مخلوق ہے اور اسی بنا پر خود اپنی نسل، اپنے ساتھ جینے والی دوسری مخلوقات اور اپنے ماحول پر بہت زیادہ اثر انداز ہے، لہٰذا یہ خالق اور مالک ہستی انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے پیغامات بھیجتی رہی ہے۔

مضمون کے اس آخری حصے میں ہم ایک بہت بڑے موضوع کو چند صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ کیا ہدایت و رہنمائی کے لیے آنے والے ان پیغامات کے سلسلے کا آخری پیغام آچکا ہے؟ کیا اسلام اس پیغام کی حتمی اور مکمل ترین شکل ہے؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پیغام کا ذریعہ

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں اس سوال ہی کے چند نکات قائم کرنے پڑیں گے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ چلیے صاحب، ہم نے مان لیا کہ ہماری اور ہماری کائنات کی خالق اور مالک ایک ہستی ہے، اور پھر یہ بھی تسلیم کہ وہ ہستی انسان ہی کو اس لائق سمجھتی ہے کہ اس کی رہنمائی کی جائے۔ نیز اس رہنمائی اور ہدایت کی خاطر وہ ایک تسلسل سے انسان کو پیغام بھی بھیجتی رہی ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہم یہ بھی مان لیں کہ یہ پیغام اسی شکل میں آتے رہے ہیں جس میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ آتے رہے ہیں، یعنی انبیا اور آسمانی کتابیں۔

یہاں پھر ہم ایک مثال کا سہارا لیتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ کسی شہر میں آپ کو ایک خاص مقام پر پہنچنا ہو۔ آپ جانتے ہوں کہ اس مقام تک آپ کی رہنمائی صرف ایک گائیڈ ہی کر سکتا ہے۔ اب اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ گائیڈ ہے، اور شہر کے بیش تر لوگ بھی اسے گائیڈ ہی گردانتے ہوں۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ آپ کو اس مطلوبہ مقام تک کا راستہ بھی ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اسی شک میں مبتلا رہیں کہ آیا وہ گائیڈ ہے بھی یا نہیں؟ تو پھر اس شک کا کوئی علاج نہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ہم کیسے یقین کر لیں کہ جس مقام تک ہمارا یہ گائیڈ ہماری رہنمائی کر رہا ہے، وہی ہمارا مطلوبہ مقام ہے، جبکہ آپ پہلے وہاں کبھی گئے نہیں، اسے پہچانتے نہیں اور نہ

ہی آپ کے پاس اس جگہ کی کوئی خاص نشانی ہے؟ اس مشکل کو سلجھانے کے لیے ہم اس مثال سے نکل کر اصل معاملے کی طرف آتے ہیں اور ایک بار پھر عمومی سمجھ بوجھ (common sense) سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشترکہ متن

صورت حال یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں چند لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھیں خدا کی طرف سے پیغام موصول ہوا ہے۔ جلد یا بدیر دنیا میں بسنے والے زیادہ تر لوگوں نے ان کے اس دعوے کو سچ تسلیم کر لیا ہے، لیکن ان دعوے داروں کے لائے ہوئے پیغامات، ان آسمانی کتابوں پر خدا کے دستخط یا سیل موجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس طرح کتابی صورت میں آسمان سے اتری ہیں کہ ہم اس بات کو بے چون و چرا مان لیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے بڑے بڑے وقفوں کے ساتھ یہ پیغامات جو ہماری رہنمائی کے لیے آئے ہیں، ان میں یا ان کی موجودہ حالت میں، جو بھی بچی کھچی یا تحریف شدہ حالت وہ ہے، کیا کچھ ایسا ہے کہ ہم باور کر لیں کہ یہ ایک ہی ہستی کی طرف سے آئے ہیں۔ یہاں ہمیں دو باتیں بڑی وضاحت سے نظر آتی ہیں:

ایک یہ کہ ان سب پیغامات میں، یہاں تک کہ جو کتابی صورت میں باقی نہیں رہے، ان میں بھی بنیادی نکات ایک ہی ہیں، یعنی توحید، عبادات کا کچھ ملتا جلتا سا نظام، معاملات کے بارے میں رہنمائی اور آخرت کا تصور جہاں اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دوسرے یہ کہ یہ تمام پیغامات نیکی اور بھلائی کا درس دیتے ہیں اور ان کی ہدایات پر عمل کرنے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح کے دروازے کھلتے ہیں۔

اگر ذہن انسانی سے پھوٹتے ہوئے ادھورے اور پیچیدہ افسانوں اور کسی منصوبے کے تحت یا کسی نفسیاتی بیماری کے زیر اثر کیے گئے نبوت کے جھوٹے دعووں کو علیحدہ رکھ دیں اور اپنے پیغام کے متن کے، تمام حقیقی پیغامات سے الگ ہونے کی بنا پر وہ ہیں بھی علیحدہ رکھ دینے کے لائق، تو صاف نظر آتا ہے کہ تمام انبیا کے لائے ہوئے ہدایت نامے اور شریعتیں ایک ہی ماخذ رکھتی ہیں، گو انسان کی اپنی مصلحتوں، نکتہ آفرینیوں اور جولانیوں نے ان میں سے بیش تر پیغامات میں کچھ نہ کچھ تحریف و تبدیلی کر دی ہے۔

الہامی کتابیں

چنانچہ الوہیت، توحید اور رسالت کے بنیادی خیال پر اتفاق رائے تعمیر کرنے کے بعد اگر ہم یہ واضح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ تمام انبیا اور شریعتیں جو تاریخ کی نظر سے اوجھل ہیں اور وہ مشہور انبیا اور کتابیں بھی جن کو عام طور پر ساری دنیا میں مذاہب کا بانی سمجھا جاتا ہے، درحقیقت سچے پیغمبر اور سچے پیغامات ہیں اور کائنات کے خالق

کی طرف سے اپنی سب سے زیادہ باشعور مخلوق اور زمین پر اپنے نائب انسان کے لیے ہدایت و رہنمائی ہیں، تو چونکہ قرآن بھی اسی سلسلے کی ایک کتاب ہے اور اس کے پیغام کا متن پہلی کتابوں سے چنداں مختلف نہیں ہے، لہٰذا ہمیں قرآن کو بھی ایک سچی آسمانی کتاب ماننا ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ یہ آخری اور حتمی کتاب ہے یا نہیں؟ تو اس کے لیے پہلے ایک عقلی اور پھر نقلی دلیل دیں گے، اور نقلی دلیل کو بھی عقل اور سمجھ بوجھ کے عمومی انداز سے سمجھیں گے۔

آخری کتاب

انسانی شعور کے ارتقا اور سماجی ترقی کا ایسی منزل پر پہنچ جانا کہ جہاں ہدایت و رہنمائی کے سلسلے کے پہلے کی طرح باقی رہنے کی ضرورت نہ رہے، ایک ایسی دلیل ہے جو اس سوال کے جواب میں اکثر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اجتہاد کی گنجایش اسلام کو ایک دین کے طور پر ہر طرح کے حالات اور صورت حال سے خطاب کرنے کی آزادی دیتی ہے۔ انفرادی طور پر ان تمام معاملات کے لیے جن کا ذکر دین کے اساسی پیغام میں نہ ہو یا جس کا علم ایک فرد کو نہ ہوسکتا ہو، اسلام اس کے لیے ذاتی سمجھ بوجھ کے ساتھ دیانت داری سے کیے گئے فیصلے کو درست قرار دیتا ہے۔ یوں یہ دین وقت کے امتحان میں کامیاب اترتا ہے۔ پھر چودہ صدیوں کا عرصہ گزرنے کے بعد کہ جس سے نصف سے بھی کم وقت میں آسمانی کتابیں تصرف اور تحریف کا شکار ہوئی ہیں، قرآن ایسی کسی بھی دست برد سے مکمل محفوظ ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ صاحب قرآن کی زندگی کا احوال جس کمال اور احتیاط کے ساتھ اپنے ایک ایک جزو کے ساتھ محفوظ ہے، تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قدیم زمانوں کے انبیا تو ایک طرف، جدید دور کے بھی کسی بھی مصلح، فاتح، سیاسی رہنما یا کسی بھی اور شخصیت کی زندگی اتنی تفصیل اور احتیاط کے ساتھ تاریخ کے اوراق کی زینت نہیں بنی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلام کی آمد کا زمانہ دیکھیں تو جیسے یہاں انسان کا طالب علمی اور تربیت کا دور ختم ہو رہا ہے اور ایک لحاظ سے عملی زندگی کا وہ دور شروع ہو رہا ہے کہ جہاں یہ تعلیم و تربیت اور یہ آخری ہدایات اور اصول قدم قدم پر اس کے کام آنے والے ہیں۔ اب نہ وہ حد کو چھوتی ہوئی سختیاں ہیں، نہ جلاوطنی اور سفر کی صعوبتوں میں تمام ہوتی زندگی کے سبق ہیں، نہ نظم و ضبط کے کڑے اصول سکھاتی پابندیاں ہیں، نہ دلوں کو نرم کر دینے والی ایسی اخلاقیات ہیں جو عدل و انصاف سے ماورا ہوں کہ جیسے ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال پیش کر دینا۔ اب تو فطرت کی تربیت کے بعد اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی زندگی ہے۔ ایک تھپڑ کا بدلہ ایک تھپڑ سے لے لینا بالکل جائز ہے، ہاں معاف کر دینا اس سے بہتر ہے۔

اس عقلی بحث کے بعد اب ہم آتے ہیں نقلی دلیل کی طرف اور دیکھتے ہیں قرآن خود اس بارے میں کیا کہتا ہے، کیونکہ ہمیں لامحالہ ان آسمانی کتابوں میں سے کسی کے آخری ہونے یا نہ ہونے سے متعلق اسی (کتاب) کے فیصلے پہ بھروسا کرنا پڑے گا۔

۱۔ ''ہم نے آج تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔'' (المائدہ ۵:۳)

چنانچہ دین کی تکمیل کے بعد اب اس میں مزید کسی اضافے یا ترمیم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ باقی آسمانی کتابوں میں جہاں آنے والے نبی کی بشارت جا بجا نظر آتی ہے، قرآن میں وہاں پچھلے انبیا کا تو بہت تذکرہ ہے، لیکن کسی ایک جگہ بھی آنے والے کسی اور نبی کی خبر نہیں دی گئی ہے۔

۲۔ ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔'' (الاحزاب ۳۳:۴۰)

ایک جماعت یہاں 'خَاتَم' کو مہر سے تعبیر کرتی ہے۔ اس معانی کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا سنا گیا ہے۔ ہمارے اس مضمون کے دامن میں اس بحث کی گنجایش نہیں ہے اور نہ ہی یہ موضوع یہاں براہ راست متعلق ہے، لیکن اتنا کہنا یہاں بہت مناسب اور امید ہے کہ کافی بھی ہوگا کہ 'ختم' کا مطلب اگر مہر یا زیادہ درستگی سے انگریزی لفظ seal بھی لیا جائے تو وہ بھی دراصل کسی دستاویز کا خاتمہ یا خط کے لفافے کو بند کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سیل یا 'ختم' کا لفظ جہاں کہیں بھی، اپنے معنوں کی جن شقوں میں بھی آئے، اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ سلسلہ یہاں تمام ہوتا ہے۔

اعادہ

اگر آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہیں تو ابتدائیے میں کی گئی گزارش کے مطابق ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ اور ہم اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ:

۱۔ کائنات خود بخود نہیں بن گئی، بلکہ بنائی گئی ہے۔

۲۔ کائنات کا خالق، مالک اور منتظم ایک ہی ہے۔

۳۔ انسان کی حیثیت زمین پر پائی جانے والی باقی کی تمام مخلوق سے جدا ایک ذمہ دار اور باشعور ہستی کی ہے۔

۴۔ کائنات کے مالک نے زمین پر اپنے اس نائب کے لیے ہدایت ورہنمائی کے لیے پیغام بھیجے ہیں۔

۵۔ وہ لوگ جنھیں عام طور پر خدا کا رسول سمجھا جاتا ہے اور وہ شریعت یا دین لے کر آئے ہیں، واقعی خدا کے پیغمبر ہیں، کیونکہ ان سب کی شخصیات کے اجزائے ترکیبی اور ان کے لائے ہوئے پیغامات کے بنیادی نکات ایک سے ہیں اور ایک ہی ماخذ سے پھوٹے ہوئے ہدایت کے ان چشموں میں ایک تسلسل اور ترتیب موجود ہے۔

۶۔ قرآن خدا کی بھیجی ہوئی آخری کتاب اور اسلام اس الوہی دین کی آخری اور حتمی شکل ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد

احسانات الٰہی

تو ہی دیتا ہے مریضوں کو شفا　　تو ہی کُل عالَم کا ہے حاجت روا
تو امید جان پُر افسوس ہے　　تو ہی تسکینِ دلِ مایوس ہے
جِس قدر مُحتاجِ آب و نان ہیں　　سب تِری سرکار کے مِہمان ہیں
تو ہی برساتا ہے پانی ابر سے　　مہر سے۔ حاشا! کِسی کے جبر سے
تو ہی دیتا ہے درختوں کو نُمو　　تو ہی دیتا ہے گُلوں کو رنگ و بو
تو ہی کرتا ہے شجر کو بار ور　　اور لگاتا ہے تو ہی برگ و ثمر
آسمان پر ہو۔ کہ ہو زیرِ زمین　　ایک ذرّہ تُجھ سے مُستغنی نہیں
پُہنچتا ہے تو ہی سب کی داد کو　　تو ہی سنتا ہے ہر اِک فریاد کو
بادشہ محمود یا بندہ ایاز　　سب تِرے محتاج ہیں اَے بے نیاز
تیرے آگے عِلّت و اسباب کیا　　تیرے ہاں کم یاب کیا۔ نایاب کیا

ہر گھڑی تیری نئی اِک شان ہے
بس یہی دین اور یہی ایمان ہے

(سفینۂ اردو، مرتب: مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ۱۰۶)